سازِ مغرب

(اردو آہنگ میں)

حصہ چہارم

مرتبہ

حسن الدین احمد

ولا اکیڈمی حیدرآباد

سازِ مغرب

(اُردو آہنگ میں)

حصّہ چہارم

مُرتّبہ

حسن الدّین احمد

ولا اکیڈیمی حیدرآباد

سلسلہ مطبوعات ولا اکیڈیمی ——— (۳۵)

زمانہ اشاعت ——— مئی ۱۹۷۸ء

تعدادِ اشاعت ——— ایک ہزار

طباعت ——— کوہ نور پریس

کتابت ——— عبدالصبور خاں

قیمت ——— بتیس روپیہ

ناشر

ولا اکیڈیمی

ملنے کا پتہ

ولا اکیڈیمی عزیز باغ سلطان پورہ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

ترتیب

فنِ ترجمہ اور منظوم ترجمے

اپنے جذبات، احساسات، خواہشات اور تجربوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے انسان نے زبان کا سہارا لیا۔ اور اس عمل ترسیل کے لئے بول چال کی زبان اور تحریری زبان دونوں کا استعمال کیا۔ انسانی گروہوں اور جغرافیائی وحدتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ زبانیں وجود میں آئیں اور ایک زبان کے جاننے والوں کے لئے دوسری زبان سے واقفیت ممکن نہ رہی۔ جس طرح جذبات، احساسات خواہشات اور تجربوں کا اظہار کسی ایک زبان میں بول چال، تقریر یا تحریر کے ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح اس اظہار کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت بھی پیش آنے لگی۔ اسی منتقلی کا نام ترجمہ ہے۔ گویا ترجمہ راست اظہار نہیں ہوتا بلکہ اصل اظہار کا عکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ لازمی طور پر اصل سے کمتر ہوگا۔

ترجمہ اصل کے برابر اس لئے بھی نہیں ہو سکتا کہ شاید ہی دُنیا کی کوئی دو زبانیں

ایسی ہوں جن کے الفاظ مفہوم کے اعتبار سے مشترک ہوں اور اُن کا ترجمہ یکساں ہو۔ کیوں کہ ہر انفرادی لفظ تاریخ کی دین ہوتا ہے اور اس کا اپنا تہذیبی پس منظر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری زبان کے مترادف لفظ کا پس منظر بالکل مختلف ہوگا۔ کنھیں دو زبانوں کے دو الفاظ صرف ایک حد تک ہم معنی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہر زبان کے ادب کی خصوصیات دوسری زبان کے ادب سے مختلف ہوتی ہیں۔ ہر ملک وقوم کے خیالات، عقائد اور ادبی روایات دوسرے ملکوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی لیے کسی ایک زبان کے شہ پارے کو دوسری زبان میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

ظاہر ہے کہ ترجمہ مشکل کام ہے۔ اپنی واردات کی شرح تو اپنی ہی زبان میں کی جا سکتی ہے۔ ع

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
آتش

یہ گویا دوسرے کے جذبات کے ابلاغ[۱] اور پھر انکی ترسیل کا کام ہے اور "زبان میری ہے بات ان کی" کے مصداق ہے۔

ترجمہ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ ترجمہ مصنّف کے قلب وذہن کی

---

[۱] "مصنف کی مجرد آگہی، خیال، فکر، جذبہ یا نقطہ نظر کو الفاظ کے ذریعہ قاری کے ذہن میں جلوہ گر ہونے کو ابلاغ کہتے ہیں۔ ترجمہ کا فن اور روایت مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس صفحہ ۱۴۲

گہرائیوں میں اتر کر اُس کے خیال اور فکر کے ابلاغ اور پھر اپنی زبان میں ترسیلِ خیال یا منتقلی کا ایسا عمل ہے جو اصل کے اندازِ ترسیل طرزِ بیان ادائے نگارش اور لب و لہجہ کے زیادہ سے زیادہ قریب رہتے ہوئے کیا جائے تاکہ دوسری زبان میں منتقل ہونے کے باوجود اصل کا اندازِ تخاطب اور طرزِ تکلم برقرار رہے۔ ترجمہ کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اختلاف زبان کے باوجود اصل کا قریب ترین مفہوم ذہن نشین ہوجائے۔

ترجمہ اور تفسیر میں بنیادی فرق ہے۔ تفسیر میں اصل کے منشاء کو صراحت سے بیان کیا جاتا ہے۔ تشریح بھی ایک طرح کی تفسیر ہے جس سے مراد مصنف کے خیالات کو تفصیل سے اپنے الفاظ میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ تلخیص سے مراد مصنف کے خیالات کو مختصر کر کے پیش کرنا ہے۔ تفسیر تشریح یا تلخیص کے مقابلے میں ترجمے میں اصل متن کو اسی اختصار کے ساتھ اپنی زبان کا جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ترجمہ کو تفسیر، تشریح یا تلخیص کے مقابلے میں زیادہ پابندیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

ترجمہ کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف اصل عبارت کا درست لفظی ترجمہ ہو بلکہ مصنف کے نظریات، معتقدات، تصوّرات اور احساسات کی صحیح ترجمانی بھی ہو۔ اصل متن کی روح اسی طریق سے برقرار رہ سکتی ہے۔ یہی ترجمانی ہے اور یہیں محض لفظی ترجمہ اور ترجمانی کا فرق واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ ترجمانی ترجمہ سے بھی دشوار تر اور نازک تر کام ہے۔

ترجمہ کے بغیر آج کوئی بھی زبان ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتی کیوں کہ وہ

ترجمہ ہی ہے جس کے ذریعہ کوئی زبان نئے الفاظ اصطلاحات محاوروں اور کہاوتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "ترجمے کی اہمیت یہی ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعہ نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں جس سے ذہنی جذب وقبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسرے زبان کی قوتِ اظہار میں نئے امکانات پیدا ہونے لگتے ہیں[1]"۔

کوئی زبان جب تک اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ اور خیالات کے جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہو کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آج اسی صلاحیت کی بدولت انگریزی زبان دُنیا کی تمام زبانوں پر حاوی ہے۔ یہی حال زبان اُردو کا ہے۔ اس کی تزئین و توسیع میں سب سے زیادہ حصہ شعرائے فارسی اردو اور ہندی کا ہے[2]۔ اردو کی بیشتر مثنویاں اور طویل داستانیں فارسی یا سنسکرت تصنیف کا ترجمہ ہیں[3]۔

ترجمہ ہی کے ذریعہ علوم وفنون لسانی پیراہن بدلتے ہیں اور تمام انسانیت کی ملک بنتے ہیں۔

خواہ مختلف مُلکوں اور خطوں کے رہنے والوں کی زبانیں ایک دوسرے

۱؎ ترجمہ کا فن اور روایت صفحہ ۱۲۲

۲؎ دو آتشہ (مرتبہ لالہ وگیان چند گدھوک ایبٹ آباد) پر تنقید زمانہ جنوری ۱۹۲۴ء

۳؎ سرور جہان آبادی حیات اور شاعری از ڈاکٹر حکم چند نیر ادارہ فروغ اردو لکھنو ۱۹۶۲ء

سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں ان کے دلوں کی زباں ایک ہی ہوتی ہے۔
بعض اوقات یہ دیکھ کر کہ دُنیا کے مختلف مُلکوں میں رہنے والے انسان جغرافی، سیاسی اور معاشرتی ماحول کے اختلاف کے باوجود ذہنی اور جذباتی طور پر کس حد تک ایک دوسرے سے قریب ہیں اور ایک ہی طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہیں حیرت ہوتی ہے "زمان ومکان کے فصل سے اصل فطرت انسانی اثر پذیر نہیں ہوتی ہے" بنیادی خیالات خواہ وہ مذہبی ہوں، سیاسی یا شاعرانہ جب ایک دفعہ اُن کی تخلیق ہو جاتی ہے تو وہ تمام دُنیا کی ملک بن جاتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح سرحدوں اور سمندروں کو پار کر لیتے ہیں۔ اب رسل و رسائل کی غیر معمولی ترقی اور سہولتوں کی وجہ سے عالمی ادب کی تشکیل کے زیادہ اور بہتر مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ مختلف ممالک کے شاعروں کے بنیادی افکار و احساسات اور شاعرانہ تخیلات میں جو بنیادی یکسانیت پائی جاتی ہے ضرورت ہے کہ شعوری طور پر اس کو ترقی دی جائے یہ کام ترجموں کا ہے جن سے نہ صرف اس زبان کو ترقی ہوتی ہے جس میں ترجمے کئے جائیں بلکہ عالمی ادب کی خدمت ہوتی بھی ہے ترجموں ہی

[1] Parallelism In English and Urdu Poets S. A. Mahdi 1965

اس کتاب میں اردو اور انگریزی شعراء کے خیالات میں غیر شعوری طور پر جو یک رنگی پائی جاتی ہے اس کی مثالیں جمع کی گئی ہیں۔ ایک سو آٹھ عنوانات کے تحت انگریزی اور اردو کے ایسے شاعروں کے خیالات جو اساتذہ کی حیثیت رکھتے ہیں ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

کی بدولت کئی ادیبوں اور شاعروں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے آج کالی داس، عمر خیام، حافظ، شیکسپیر، گوئٹے اور غالب کو جو عالمی شہرت حاصل ہے وہ محض ترجموں کی رہین منّت ہے۔

ترجمہ ایک باقاعدہ اور مستقل فن ہے۔ ترجمہ کے فن میں مہارت اور قدرت پیدا کرنے کے لئے اور دوسرے ہنروں کی طرح شوق اور صلاحیت کے ساتھ تربیت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمہ محنت طلب کام ہے۔ ایک طرف وہ سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس فن کے اُصولوں سے واقفیت بھی لازم ہے۔

اس فن کو برتنے اور اس میں مہارت تامہ پیدا کرنے کے لئے کم سے کم دو زبانوں کی لغت اور اُن کی ادبیات سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک طرف وہ زبان یا زبانیں جن سے ترجمہ کرنا مقصود ہو اور دوسری طرف وہ زبان جس میں ترجمہ کرنا ہو۔ دونوں زبانوں کے مزاج کو پہچاننا بھی لازم ہے۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو اس سے صرف واقفیت ہی کافی نہیں بلکہ اس زبان کی لغت، اِصطلاحات، محاوروں اور خاص طور پر مترادفات پر ماہرانہ عبور ازبس ضروری ہے۔

ترجمہ کے لئے دوسری اہم چیز موضوع سے واقفیت ہے۔ بہ الفاظ دیگر مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصل متن کے پس منظر سے پُوری واقفیت حاصل کرے۔

ترجمہ کا بنیادی مقصد اصل متن کے خیال اور مفہوم کی مناسب ادائیگی

ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مترجم کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بالطبع ذہین ہو اور اس نے اصل متن کے مزاج کو پالیا ہو اور پھر اصل کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق نیا قالب دیا ہو۔

جس طرح ترسیل کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں اسی طرح ترجمے بھی مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ آسانی کے لئے ہم ان کی تین قسمیں قرار دے سکتے ہیں۔ ہر شعبہ میں ترجمہ کے ملحوظات جُدا جُدا ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہر نوعیّت کے ترجمے کا طریقۂ کار اور اس کے فنی مطالبات مختلف ہوتے ہیں۔

پہلی قسم معلوماتی ادب یعنی خالص علمی اور سائنسی متن کے ترجموں کی ہے ان ترجموں کی حد تک مترجم کا کام معلومات کی ترسیل ہے یعنی ایک زبان میں موجود معلومات کے ذخیرہ کو دوسری لسانی برادری تک پہنچانا یہ ترجمے نسبتاً آسان ہوتے ہیں موضوع پر عبور اور ہر دو زبانوں اور متعلقہ علمی اصطلاحوں سے واقفیت ہو تو ترجمہ بڑی روانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان تراجم کی حد تک لغت کا استعمال معاون ہو سکتا ہے وہ علمی تراجم میں لب و لہجہ تاثیر الفاظ کی نشست وغیرہ کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی اس کے فکری پہلو اور نفسِ موضوع کا منطقی ابلاغ ہوتا ہے۔[1]

دوسری قسم تہذیبی سطح کے ترجموں کی ہے۔ مثلاً افسانوں اور ناولوں کے ترجمے مترجم کا کام بقول ڈاکٹر محمد حسن ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں ڈھالنا ہے۔

تیسری قسم خالص ادبی یا جمالیاتی سطح کے ترجموں کی ہے۔ ایک زبان

---

[1] ڈاکٹر اشرف رفیع نظم طباطبائی حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ دسمبر ۱۹۷۳ء

کے تخلیقی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا بڑا دشوار اور نازک کام ہوتا ہے وہ ادبی اور بالخصوص شعری ترجموں میں اگر علمی ترجموں کی سی وفاداری اور اس کے منطقی ربط کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے تو ضروری نہیں کہ اچھے نتائج حاصل ہوں کیوں کہ ادبی الفاظ تلمیحات تشبیہات استعارے، کنایے، مثالیں، علامتیں، تراکیب اور محاورے ہر زبان میں اپنی جُدا جُدا شان رکھتے ہیں اور اُن کے علمی اور لفظی ترجمے سے زیادہ ان کے مفہوم اور معانی کی ترجمانی اہم ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر صورتوں میں ان کے مترادفات بلکہ مماثلات زیادہ موثر ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ ادبی تراجم میں تاثیر کا ابلاغ بنیادی اہمیت رکھتا ہے[۱]"، کسی بھی تخلیقی فن پارہ کے ترجمہ میں کچھ باقی رہ جاتا ہے اور کچھ ضائع ہو جاتا ہے کیوں کہ ہر زبان کے ادب میں اس کا اپنا اسلوب بھی شامل ہوتا ہے جس کو ترجمہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا اور ساتھ ہی اس زبان کے اسلوب کو شریک کرنا ناگزیر ہوتا ہے جس میں ترجمہ کیا جائے گا۔ رابرٹ فراسٹ نے شاعری کی تعریف یوں کی ہے کہ شاعری وہ کچھ ہے جو ترجمہ میں باقی نہ رہے۔ تخلیقی اور شعری ترجموں کا شمار جمالیاتی سطح کے ترجموں میں ہے۔ ان ترجموں میں مجموعی تاثیر کو پیش کرنا ہوتا ہے اور اصل تخلیق کے مرکزی خیال کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے یہ خود ایک تخلیقی عمل ہے ہر تخلیقی عمل کی طرح تخلیقی ترجمہ کا عمل بھی ایک ایسی پُراسرار ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے

---

۱ ڈاکٹر اشرف رفیع۔ نظم طباطبائی حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ دسمبر ۱۹۷۲ء

جو سراسر ناقابلِ توجیح ہے۔ اس کاوش میں یہ تعین کرنا بڑا مشکل ہے کہ اکتساب کے حدود کہاں ختم ہوتے ہیں اور وجدان کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں تخلیقی ترجمہ کی ہر منزل ایک نیا تجربہ ہوتی ہے یہ حقیقتاً ایک دشوار کام ہے۔ شرح آرزو اپنی ہی زبان میں اور خود صاحبِ واردات کو بھی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ قلب پر جو وارداتیں گزرتی ہیں اُن سب کا بیاں لب پر یا نوک قلم پر نہیں آسکتا۔ ع

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

میرؔ

جب صاحبِ واردات کی یہ مشکل ہے تو مترجم کی مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور جب شعری ترجمے منظوم بھی ہوں تو اس مشکل کا اندازہ لگانا بھی محال ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر سے "ترجمے آزاد نیم آزاد اور قطعاً" پابند بھی ہو سکتے ہیں۔ ان تینوں کے علاوہ ترجمے کی ایک اور خصوصیت (قسم) بھی ہو سکتی ہے جس کا اردو زبان میں قابل لحاظ ذخیرہ موجود ہے اور یہ چوتھی قسم تحت اللفظ ترجمے کی ہے۔ جس کی مثالیں مولانا شاہ عبدالقادر اور رفیع الدین محدثین دہلی کے تراجم کلامِ مجید سے لی جا سکتی ہے[۱]۔

---

[۱] نظم طباطبائی از ڈاکٹر اشرف رفیع دسمبر ۱۹۷۳ء

جہاں تک اردو کا تعلق ہے ہماری زبان نے ترجموں کی روایت کو ابتداء ہی سے اپنایا۔

اردو زبان میں مغربی عُلوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی اولیں کوشش کا سہرا فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے سر ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے تراجم برطانوی استعمار کی تقویت کے لئے انگریز افسروں کی ایما پر کئے گئے یہ ترجمے کسی منظّم کوشش کے طور پر اور تہذیبی خدمت کے تحت نہیں بلکہ سیاسی مصالح اور ضرورتوں کے تحت ہوئے[1]۔ اس کالج کے پروفیسر گل کرسٹ نے اپنی کتاب "ہندوستانی زبان کے قواعد" میں شیکسپیر کے ڈراموں کے اقتباسات کا تحت اللفظ اردو ترجمہ شامل کیا۔ اس طرح گل کرسٹ کی نگرانی میں فطرتؔ لکھنوی نے انجیل مقدس کا اردو ترجمہ کیا ان دونوں تراجم کا شمار بلاشبہ جمالیاتی سطح کے ترجموں میں کیا جا سکتا ہے۔ منظوم تراجم کے سلسلے میں ان کا ذکر اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اُن ترجموں نے امکانات روشن کئے اور منظوم ترجموں کے لئے راستہ ہموار کیا۔

---

[1] اس کے برخلاف امیر پائے گاہ نواب فخرالدین خاں شمس الامراء ثانی کی نگرانی اور سرپرستی میں ترجموں کا جو کام ۱۸۳۳ء کے لگ بھگ حیدرآباد میں ہوا وہ محض علمی خدمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ خواجہ حمید الدین شاہد اپنی کتاب "اردو میں سائنسی ادب" میں فرماتے ہیں "اردو زبان میں مغربی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی منظم کوشش تھی۔ دہلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی تحریکیں اس کے بعد کی ہیں۔"

فارسی میں لفظ نظم موزوں کرنے کے معنی میں اِستعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں نظم کے وسیع تر تصوّر میں شاعری کی ہر صنف اور ہر شعر شامل ہے لیکن عام استعمال میں سب سے پہلے یہ لفظ انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کے لئے استعمال ہوا اور یہ اصطلاح غیر شعوری طور پر نئی شعری تخلیقات کے لئے متعین ہو گئی[۱]۔ نظم کو اس متعین مفہوم کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد اِستعمال کیا گیا۔

جدید نظم کا بیان منظوم ترجموں کے بیان کے بغیر مکمّل نہیں ہو سکتا۔ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان پر غیر ملکی تسلط قائم ہو جانے کے بعد مغربی اور خصوصاً انگریزی تہذیب کے اثرات سے ہماری تہذیب اور معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زبان اور شاعری بھی ان اثرات سے نہ بچ سکے۔ اُردو زبان میں بھی نئے دور کا آغاز ہوا۔ دوسرے تجربوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے توسط سے اُردو میں ہیئت اور مواد کے نئے راستوں کی تلاش شعوری طور پر کی جانے لگی۔ انگریزی ادب سے فائدہ اُٹھانے کا رجحان پیدا ہوا اور انگریزی نظموں کے خیالات کو اُردو نظم کے قالب میں ڈھالنے کی باضابطہ کوششیں شروع ہوئیں۔

جمالیاتی سطح کے ترجموں کے منجملہ اُردو شاعروں نے منظوم ترجمے کئے تو گویا انھوں نے ایک نئے مشکل اور سنگلاخ میدان میں طبع آزمائی کی اصل نظم کی لطافتوں باریکیوں، نزاکتوں اور گہرائیوں سے کماحقّہ واقفیت کے

---

[۱] جدید اردو نظم اور یورپی اثرات از ڈاکٹر حامدی کاشمیری صفحہ ۱۴

بغیر ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اصل نظم سے انصاف ہوسکتا ہے۔
نہ صرف دوسروں کے خیالات کو بلکہ اجنبی خیالات کو اپنی زبان کا جامہ پہنانا ایک مشکل انوکھا لیکن دلچسپ تجربہ تھا اُن ترجموں نے اُردو ادب کو جدید خیالات، نئی تشبیہات اور تازہ استعارے دیئے۔ اور اردو شاعری کو نئی جہت میں وسعت دی۔ انھوں نے دوسری زبان کے تخیل کو اپنی زبان میں دلکش انداز میں منتقل کرنے اور تخیّل غیر کی باریکیوں کو قائم رکھنے کے مشکل کام میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

یہ بات اور کھُل کر سامنے آتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری میں نہ صرف بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی ہے جس کی وجہ سے صوتی اعتبار سے اردو شاعری کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے، بلکہ اردو شاعری کا اپنا خاص انداز ہے۔ اُردو شاعروں نے اپنے قلم کو جنبش دی تو بے شمار زنجیروں کو اس کے پاؤں میں ڈال کر کامیاب اور بامحاورہ ترجمہ کی خواہش، دوسرے کے خیالات کی ترجمانی کی کوشش، پھر یہ جستجو کہ ترجمے ترجمے نہ رہیں ترجمانی معلوم ہوں۔ اصل نظم کی جذباتی فضا کو قاری تک پہنچایا جائے۔ الفاظ کا صوتی اور لغوی انتخاب اور ترجمہ کی بحر اصل سے ہم آہنگ ہو۔ کامیاب ترجمہ جس میں اصل نظم کا حُسن اسی آب وتاب سے باقی رہے کوئی آسان کام نہیں۔ زبان اور حُسن بیان کے راستے میں کتنی دشواریاں حائل ہوتی ہیں نظم میں استعاروں اور کنایوں کی موجودگی بھی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔
ان رکاوٹوں کو اکبر الٰہ آبادی جیسے قادر الکلام شاعر نے بھی محسوس کیا۔ ع

اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط
معانی میں پیدا نہ ہو ربط وضبط
موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں
مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں[1]

ان سب پابندیوں اور مشکلات کے باوجود نہ صرف ہمارے شاعروں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے بلکہ اکثر وبیشتر نظمیں خود بول اٹھی ہیں ہمارے شاعروں نے نہایت دلچسپ تجربے کئے اور بعض ترجموں کو بلاشبہ اصل کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔

جدید اردو نظم کی تشکیل میں منظوم تراجم کا بڑا اور قابلِ لحاظ حصّہ رہا ہے[2]۔ اردو نظم کے نئے مزاج کو بنانے میں بقول جناب خلیل الرحمٰن اعظمی، اقبال کے علاوہ مخزن گروپ۔ ان تمام شعراء کا بھی ہاتھ ہے جنھوں نے بڑی تعداد میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے۔ اسی طرح جو شاعر جدید اردو نظم کے نقیب تھے ان میں بیشتر ایسے تھے جنھوں نے منظوم تراجم کئے اور ان ترجموں

۱؎ یہ اشعار اکبر الٰہ آبادی کی نظم آب لوڈور سے لئے گئے ہیں جو انگریزی کے شاعر سدے کی نظم کا ترجمہ کرنے کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔

۲؎ "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں میاں بشیر احمد اور منصور احمد نے ایسے کامیاب اور خوب صورت منظوم ترجمے کئے جنھوں نے نظم معریٰ اور نظم آزاد کی جدید ہیئت سے اہلِ اردو کو مانوس کیا۔

کے ذریعے جدید نظم کے ارتقا میں مدد دی ۔

"انجمن پنجاب" لاہور کے شاعروں محمد حسین آزاد (۱۸۳۳ء-۱۹۱۰ء) اور خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) نے اُردو شاعروں کو انگریزی ادب سے استفادہ کی طرف راغب کیا۔ اور خود انگریزی زبان سے کم واقفیت رکھتے ہوئے بھی انگریزی نظموں کے اردو میں منظوم ترجمے کر کے ایک مثال قائم کی اور نیا راستہ دکھلایا ۔

انجمن پنجاب کا قیام ۱۸۶۷ء میں کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے جلسہ منعقدہ ۱۵ راگست ۱۸۶۷ء میں محمد حسین آزاد نے "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" کے موضوع پر مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے کہا ۔

"شاعری میں نئے انداز کی خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ۔ ہاں صندوق کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے ۔"

اُردو شاعری میں عبارت کا زور، مضمون کا جوش وخروش اور لطائف وصنائع کے ساماں بقول آزاد چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ۔

۳۰ رجون ۱۸۷۴ء کو انجمن کے دوسرے جلسے میں "زمستان" کے موضوع پر نظمیں پڑھی گئیں ۔ اُردو نظم کی تاریخ میں طرحی مشاعرے کے مقابلے میں

موضوعاتی مشاعرہ ایک انقلابی اقدام تھا۔ اس موقع پر بھی محمد حسین آزاد نے اپنی تقریر میں اردو شاعری کے رنگ و آہنگ کو بدلنے اور انگریزی شاعری سے استفادہ کا واضح طور پر مشورہ دیا۔ محمد حسین آزاد نے اپنے خیالات اخبار "آفتاب پنجاب" کے ذریعہ بھی اردو شعراء تک پہنچائے اور ان کو متاثر کرنا شروع کیا۔

محمد حسین آزاد نے اہلِ ملک کو انگریزی شعروادب کی عظمت اور پھیلاؤ کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے جدید نظم کے بارے میں اپنے خیالات بھی پیش کیے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ نظمیں بھی لکھیں جو ان کے نظریات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اِس طرح انھوں نے اردو شاعری میں ایک نئی جان ڈالنے کی سعی کی۔

محمد حسین آزاد کی اس کوشش کی اہمیت یوں ہے کہ یہ ایک شعوری اور باضابطہ کوشش تھی

اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالی اہلِ اردو کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

"تمھاری شاعری جو کہ دروبست عشق و مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھی جائے۔"

مولانا حالی نے "زمزمہ قیصری" کے عنوان سے مسٹر سٹوک کی انگریزی نظم کا ترجمہ کیا۔ اصل نظم کا اردو ترجمہ ان کو دیا گیا تھا اور انھوں نے ان

خیالات کو منظوم کیا۔ اسی طرح ان کی نظم تنہائی کا خیال انگریزی سے لیا گیا ہے۔ حالی کی نظم "جواں مردی کا کام" جو انھوں نے ۱۸۷۲ء میں لکھی تھی انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ نہیں ہے کیوں کہ خود حالی نے اس پر یہ نوٹ دیا کہ "یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اس کو اردو میں بہ اضافہ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے۔"

قلق میرٹھی[1] نے بعض حکامان وقت کی فرمائش پر منتخب انگریزی نظموں کا ترجمہ "جواہر منظوم" کے نام سے کیا جس کی طباعت ۱۸۶۷ء میں گورنمنٹ پریس الٰہ آباد میں ہوئی۔ جواہر منظوم کو اردو منظوم تراجم کا پہلا مجموعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان منظوم تراجم پر مرزا اسداللہ خاں غالب نے نظر ثانی بھی کی تھی۔

---

[1] نام غلام مولیٰ عرف مولا بخش اور تخلص قلق تھا۔ میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ قلق میرٹھی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے دلی چلے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک آپ دہلی میں اقامت گزیں رہے اور طب کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ فارسی زبان مولانا امام بخش صہبائی سے پڑھی۔ شعر و سخن میں حکیم مومن خاں مومن کی شاگردی اختیار کی۔ غالب ذوق اور جملہ معاصر اساتذۂ فن سے آپ کے تعلقات اور روابط قائم تھے۔ اور دہلی کی تباہی و بربادی پر افسردہ دل ہوکر وطن مالوف واپس آگئے تھے۔ ۱۲۹۷ ہجری (۱۸۸۰ء) میں میرٹھ میں انتقال فرمایا۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا کے مضمون سے اقتباس۔ زمانہ نومبر ۱۹۲۵ء)

اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء۔ ۱۹۱۷ء) نے ۱۸۶۷ء میں انگریزی کی چار نظموں کے منظوم ترجمے "کیڑا"، "ایک قانع مفلس"، "موت کی گھڑی" اور "وفادر ولیم" کے عنوان سے کئے۔[1] اسماعیل میرٹھی نے اور بھی منظوم ترجمے کئے۔

اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں ایک انتخاب اٹاوہ سے "منتخب انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے" از بانکے بہاری لال شائع ہوا۔

مغربی نظموں کے ترجموں کی رفتار کو تیز کرنے میں ادبی رسالوں نے اہم رول ادا کیا۔ رسالہ "مخزن" نے بالخصوص انگریزی نظموں کے ترجموں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس رسالے کے اجراء کا بنیادی مقصد ہی منظوم ترجموں کی ترویج تھا۔ اپنے پہلے شمارے میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا اس مقصد کو اس طرح واضح کیا گیا:

"انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں اور انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تاکہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔

رسالہ "دل گداز" نے بھی اس مقصد کو آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے عشرے میں کثیر التعداد انگریزی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا گیا۔ ان تراجم سے اُردو کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء-۱۹۲۶ء) نے نہ صرف منظوم ترجمے کیے بلکہ انگریزی نظم کے طرز بیان کے تتبع میں نظم غیر مقفیٰ (جس کے لیے بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے نظم معریٰ کا نام تجویز کیا) کا تجربہ بھی کیا۔ شرر نے اردو نظم میں اس جدید اسلوب اور جدید ہیئت کو

---

[1] یہ ترجمے سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہیں۔

مروج کیا اور اسے بطور ایک تحریک فروغ دیا۔

اُردو کی پابند نظم میں ایک نئے انداز کی ابتداء "گورِ غریباں[1]" سے ہوتی ہے یہ منظوم ترجمہ نظم طباطبائی (۱۸۵۲-۱۹۳۳ء) نے عبدالحلیم شرر کی فرمائش اور مولوی عزیز مرزا کے اصرار پر کیا تھا[2] جو پہلی بار رسالہ دل گداز کے جولائی (۱۸۹۷ء) کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ طباطبائی کے منظوم ترجموں میں سب سے طویل اور اہم نظم گورِ غریباں ہے۔ اس منظوم ترجمے نے سندِ قبولیت حاصل کی اور اس کو ان منظوم تراجم میں شمار کیا جاسکتا ہے جو اصل سے کسی طرح کم نہیں۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے اس نظم کے تعارفی نوٹ میں لکھا وہ ایسی مقبول روزگار ایسی سرمایہ انگلستان نظم جس کا ترجمہ ہمارے واجب التعظیم علامہ اور مستند زمانہ شاعر جناب مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نے کیا ہے مگر کس خوبی

---

[1] یہ ترجمہ سازِ مغرب (حصہ اول) میں شریک ہے۔

[2] انجمن ترقی اُردو کے اراکین نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ انگریزی نظموں کا ترجمہ کر کے غزل گو شاعروں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کے لئے گرے کی ایلجی کا انتخاب ہوا۔ جب کوئی منظوم ترجمہ کامیاب نہ ہوا تو خواجہ غلام الثقلین نے نثر میں ترجمہ کیا۔ جب یہ ترجمہ عزیز مرزا کی نظر سے گزرا تو انھوں نے حیدر آباد کے شعراء کو وہ نثری ترجمہ دے کر اس کو نظم کرنے کی فرمائش کی۔ طباطبائی نے جو انگریزی سے شدید واقف تھے اپنی بے مائیگی کا اظہار کیا۔ عزیز مرزا نے انھیں بنرجی کی شرح دی۔ نظم نے اس شرح کا ۷ دن تک مطالعہ کیا اور تین دن میں اس کا ترجمہ گورِ غریباں کے عنوان سے پیش کیا۔

سے جس کا اظہار کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے ایسی جاں گداز اور موثر نظمیں اوریجنل طور پر بھی اردو میں کم لکھی گئی ہیں نہ کہ ترجمہ اور پھر اس پابندی کے ساتھ کہ جس طرح پہلے مصرعے کا قافیہ تیسرے مصرع سے اور دوسرے مصرع کا چوتھے مصرعے سے انگریزی میں ملتا ہے اسی طرح ہمارے مولانا نے بڑے لطف سے اپنی طرز قافیہ بندی کو چھوڑ کر اردو میں ملایا ہے اردو میں اِسٹینزا لکھنے کی ابتدا اس نظم سے ہوتی ہے۔"

بقول ڈاکٹر اشرف رفیع "اُردو نظم میں شعری تجارب کے معاملہ میں طباطبائی کی حیثیت طائرِ پیش رس کی ہے۔"

نظم طباطبائی نے گورِ غریباں کے علاوہ چند اور انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے۔ انھوں نے چند نظمیں انگریزی نظموں کی اتباع میں لکھیں جو ہیئت کے اِعتبار سے اہمیّت رکھتی ہیں۔

وحید الدین سلیم (۱۸۵۹-۱۹۲۸ء) نے چند انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے اور کمال کر دکھایا۔ ان کی نظم "گوشہ عافیت" میں انگریزی زبان کے شاعر ڈائر کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے انھوں نے مظاہرِ فطرت سے متاثر ہو کر بھی شاعری کی۔ ایسے مواقع پر ان کی شاعری ورڈسورتھ کی شاعری سے قریب نظر آتی ہے۔ ان کی بعض نظمیں جدید نظم کے ارتقاء میں بڑی اہمیّت رکھتی ہیں۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (۱۸۶۶-۱۹۵۴ء) نے منظوم ترجمے کئے۔ انگریزی بلینک ورس کے تتبع میں نظم معریٰ لکھی اور انگریزی نظموں

کی اسٹینزا بندی کے طرز پر اُردو نظموں میں بھی اسٹینزا یا بند استعمال کیے۔

نادر علی خاں نادر کاکوروی (۱۸۶۷ء-۱۹۱۲ء) نے کئی انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کیے۔ ان ترجموں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں اصل کی پوری ترجمانی ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان کے سب منظوم ترجمے بلند پایہ مؤثر اور کامیاب ہیں۔ بعض ترجموں میں نادر نے آزادی سے کام لیا ہے مثلاً ان کی مشہور نظم "گھنٹہ نہیں بجے گا"[1] کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انگریزی نظم کو اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے وضاحتی پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ان کے منظوم ترجمے "گزرے ہوئے زمانہ کی یاد"[2] کو شہ کار قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بارے میں جناب ممتاز حسن لکھتے ہیں۔

"گزرے ہوئے زمانہ کی یاد" نہ صرف نادر کا بہترین ترجمہ ہے بلکہ اُردو شاعری کا بہترین ترجمہ کہنا چاہیے۔[3]

عیسیٰ چرن صدا یکم اپریل (۱۸۷۰ء-۱۹۵۷ء) نے ملٹن کی شہرۂ آفاق نظموں پیراڈائز لاسٹ اور پیراڈائز ری گینڈ کے منظوم ترجمے فردوس گم گشتہ اور فردوس بازیافتہ کے نام سے کیے۔ اور سامسن اگونائسٹس کا ترجمہ سامسن محزوں کے نام سے کیا۔ عیسیٰ چرن صدا کا تعلق آگرہ کے ایک معزز کائستھ خاندان سے تھا۔

---

[1] یہ نظم سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہے۔

[2] یہ ترجمہ سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہے۔

[3] ماہِ نو صفحہ ۱۷ ستمبر ۱۹۵۹ء

نام دیبی پرشاد تھا۔ ان کے والد منشی اجودھیا پرشاد پیشۂ وکالت انجام دیتے تھے۔ صدا نے بچپن میں ایک قدیم مذاق کے مشرقی مکتب میں فارسی کی تعلیم پائی۔ ۱۸۸۵ء میں دین مسیحی اختیار کیا۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ فردوس باز یافتہ منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دیباچہ مولانا محمد عبدالحلیم شرر نے لکھا۔

ظفر علی خاں (۱۸۷۰-۱۹۵۶ء) نے چند منظوم ترجمے کئے ہیں لیکن یہ سب ترجمے معیاری اور کامیاب ہیں "ندی کا راگ"[1] ایک خوب صورت نظم ہے جس کا شمار اچھے منظوم ترجموں میں کیا جا سکتا ہے۔

درگا پرشاد سرور جہاں آبادی (۱۸۷۳-۱۹۱۰ء) کے کلام میں منظوم ترجمے کافی تعداد میں ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں انگریزی اور سنسکرت نظموں کے منظوم ترجمے ملتے ہیں۔ ان کے سب منظوم ترجموں کو اچھے ترجمے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ترجمے بحیثیت مجموعی تخلیقی انداز رکھتے ہیں۔ منظوم ترجموں میں اصل نظموں کی روح کو اردو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ بقول باواکرشن گوپال مغموم سرور جہاں آبادی نے انگریزی کے مشہور شعراء کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا زبردست اثر ان کی شاعری پر تھا۔

"سرور کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا یا ناشاعروں اور کم مایہ لوگوں نے

---

[1] یہ ترجمہ سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہے۔

ہتھیا لیا کبھی حقیر معاوضہ دے کر اور کبھی معاوضہ کے بغیر۔[1] سرور کی وفات کے بعد رسالہ زمانہ (فروری ۱۹۱۵ء) میں کچھ خطوط شائع ہوئے تھے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پیارے لال شاکر میرٹھی نے بھی یہی حرکت کی تھی چنانچہ سرور کا بیشتر کلام شاکر میرٹھی کے نام سے چھپ چکا ہے۔[2] اس وقت تک شاکر کے نام سے شائع شدہ ساٹھ نظمیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں سے پچاس نظمیں ترجمہ شدہ ہیں اور دس سرور کی طبعزاد ہیں۔ سرور نے کالیداس کی مشہور سنسکرت نظم "رتو سنگھار" کا منظوم ترجمہ کیا تھا اور یہ ترجمہ "اکسیر سخن" کے عنوان سے شاکر میرٹھی کے نام سے چھپ چکا ہے۔

"سرور نے بیشتر تراجم میں اصل نظم کی ہیئت وزن اور بحر کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض اوقات کچھ تصرفات کئے ہیں۔ لیکن مصنف کے بنیادی خیال میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی۔ (ترجموں کی خوبی سے ان تصرفات کا جواز نکلتا ہے۔) اگرچہ غیر ملکی جذبات اور احساسات میں شعریت پیدا کرنا دشوار کام ہوتا ہے لیکن سرور کی نظموں میں بالخصوص آزاد ترجموں میں زبان و بیان کا لطف اور شعریت پیدا کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ انھوں نے ترجمے میں اردو شاعری کی ادبی اور فنی روایات کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ زبان کی صفائی۔ بندش اور ترکیب کی چستی اور اسلوب بیاں کی شگفتگی سے بعض تراجم پر طبعزاد نظموں کا گمان ہوتا ہے"

---

[1] سرور جہاں آبادی حیات اور شاعری از ڈاکٹر حکم چند نیر۔

[2] مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے رسالہ زمانہ فروری ۱۹۱۵ء اور اپریل و مئی ۱۹۱۵ء

سید محمد رضا من کنتوری (۱۸۷۶-۱۹۰۶ء) نے چند مشہور انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے۔ ان ترجموں کا مجموعہ "ارمغانِ فرنگ" کے نام سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ جب کہ ان کی عمر پچیس[۲۵] سال تھی۔ انگریزی نظم کو اردو لباس پہنانے میں جس قدر کوششیں اس وقت تک کی گئی تھیں ان میں یہ پہلی باقاعدہ اور کامیاب کوشش تھی[۱]۔

غُلام بھیک نیرنگ (۱۸۷۶-۱۹۵۲ء) کے مجموعہ کلام "کلام نیرنگ" اور "غبار افق" میں منظوم تراجم بھی شریک ہیں "مقصودِ اُلفت" اور "جانِ شیریں[۲]" کو معیاری منظوم ترجمے قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) کی خوب صورت نظمیں "پیام صبح" "عشق اور موت" "رخصت اے بزم جہاں" انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں جو رسالہ مخزن کے اثر سے کئے گئے تھے[۳]۔ اقبال کی بعض نظمیں انگریزی نظموں کا بالکل ترجمہ تو نہیں ہیں لیکن ان نظموں میں انگریزی نظموں کی باز گشت سنائی دیتی ہے۔

منظوم ترجموں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں جن غزل گو شعراء نے حصہ لیا ان میں حسرت موہانی (۱۸۸۱-۱۹۵۱ء) اور عزیز لکھنوی (۱۸۸۲-۱۹۳۵ء)

---

[۱] ارمغانِ فرنگ پر تنقیدی مقالہ از محمد صادق علی خاں مخزن نومبر ۱۹۰۲ء

[۲] یہ دونوں منظوم ترجمے سازِ مغرب حصہ دوم میں شریک ہیں۔

[۳] یہ ترجمے سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہیں۔

سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ باوجودیکہ حسرت موہانی نے بعد میں نظم گوئی ترک کر دی تھی ان کے منظوم ترجموں کو اعلیٰ درجہ کے ترجموں میں شامل کیا جا سکتا ہے عزیز لکھنوی نے منظوم ترجموں کے وقار کو بلند کیا اور اپنی شعری صلاحیتوں سے اس صنفِ ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔

منشی مہاراج بہادر برق (۱۸۸۴ - ۱۹۳۶ء) نے بھی چند انگریزی نظموں کے ترجمے کئے ہیں۔ بقول جگت موہن لال رواں "وہ مغربی تخئیل اور جذبات سے اپنے ادب کے دامن کو مالا مال کرنے کی فکر ترجموں میں کرتے ہیں[۱]"

نواب میر جعفر علی خاں اثر لکھنوی (۱۸۸۵ - ۱۹۶۷ء) نے انگریزی اور دوسری زبانوں سے اردو نظم میں کافی تعداد میں ترجمے کئے۔ انھوں نے ان ترجموں کے ذریعہ جدید نظم میں ہیئت کے کامیاب اور دلچسپ تجربے کئے۔ ان کے منظوم تراجم کا مجموعہ "رنگ بست" کے نام سے شائع ہوا[۲]۔ اس مجموعے میں انگریزی کی نو نظموں کے منظوم ترجمے شریک ہیں۔ جن میں کسان باغی انسان۔ تھار آخری وصیّت کا شمار اچھے اور معیاری ترجموں میں کیا جا سکتا ہے۔

تلوک چند محروم (۱۸۸۷ - ۱۹۶۶ء) نے انگریزی نظموں کی ایک بڑی تعداد کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے[۳]۔ ان کے منظوم ترجموں کو کامیاب کوشش قرار

۱۔ مقدمہ مطلع انوار، ۲۔ یہ مجموعہ اردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہوا۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ غالباً ۱۹۴۸ء سے کچھ پہلے شائع ہوا۔ ۳۔ چند اہم ترجمے یہ ہیں۔
موت کا موسم، ایک خاندان کی قبریں، ایام غم، سپاہی کا خواب، حسرت پرواز، ترانۂ عشق، پیمانِ وفا، ترمِ گفتاری، حُبِ وطن، کہاں سے کیا، بقائے محبّت،

دیا جا سکتا ہے "بچہ کا پہلا احساسِ غم"[۱] ایسی ہی نظم ہے جس کو پڑھنے سے اصل تخلیق سے قربت کا احساس ہوتا ہے۔ مرحوم نے ترجمہ میں بھی اسٹینزا بند کا استعمال کیا ہے اور پہلے تیسرے اور دوسرے چوتھے مصرعوں کو ہم قافیہ کیا ہے جیسا کہ اصل میں ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں سے اقتباسات کے منظوم ترجمے بھی کئے ہیں۔

محمد عظمت اللہ خاں (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۲۷ء) نے کئی انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ کوئل، ننھا غاصب، ہم شاہیں۔ یونان کے جزیرے، چھیل چھبیلی، اگر موت بن خواب کی نیند ہووے، اور تریا چاہ[۲] ایسی نظمیں ہیں جن کو دل کش اور کامیاب ترجمے قرار دیا جا سکتا[۳] ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان منظوم ترجموں میں ہیئت کے نئے اور انوکھے تجربے کئے گئے ہیں جن کو جدید نظم کے ارتقاء میں اہمیت کے حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ "سریلے بول" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے جو حیدر آباد سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔

۱؎ یہ نظم سازِ مغرب حصہ اول میں شریک ہے۔

۲؎ یہ سب نظمیں سازِ مغرب حصہ دوم میں شریک ہیں۔

۳؎ جناب آل احمد سرور ان منظوم ترجموں کو بہت کامیاب نہیں مانتے اپنے مقالہ عظمت اللہ خاں اور سریلے بول میں لکھتے ہیں "بہ حیثیت مجموعی عظمت اللہ خاں مرحوم نے نظموں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ باوجود کہیں کہیں دلکش ہونے کے بہت کامیاب نہیں ہے"

حفیظ جالندھری (پیدائش ۱۹۰۰ء) کا منظوم ترجمہ "کاہل کا گیت" بھاگتا کی ہیئت میں ہے۔ اس کا شمار ان تخلیقی ترجموں میں ہے جنھوں نے جدید نظم کے ارتقا میں ... امداد دی۔

یہ ایک اجمالی تذکرہ تھا اس عظیم جماعت کا جس میں ہمیں اردو شاعری کے جدید دور کی بیشتر بڑی شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ اس جماعت نے منظوم ترجموں کی تحریک کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس کی قیادت کی۔ ان ... نے جدید اردو شاعری کی تحریک کو بہت فائدہ پہنچایا اور اردو شاعروں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ ان متقدمین کو رومانوی تحریک کے علمبردار انگریز شاعروں نے زیادہ متوجہ کیا۔ ان کے ہم عصر اور بعد کے آنے والوں نے بھی اس صنف ادب کے وسیع تر میدان میں طبع آزمائی کی اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان سب کا ذکر محض خوفِ طوالت سے نہیں کیا جا سکا۔

حالیہ زمانہ میں جو اضافے ہوئے ہیں ان میں ارشد صدیقی کے منظوم ترجموں کا مجموعہ "عکس خیال" لائقِ ذکر ہے جسے دانش کدہ بھوپال نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ اس میں پندرہ منتخب انگریزی نظموں کے خوب صورت منظوم ترجمے شامل ہیں۔ جناب نیاز فتحپوری کے الفاظ میں "جناب ارشد صدیقی نے اس مشکل منزل کو جس آسانی سے طے کیا ہے اس کو دیکھ کر ان کی سخنورانہ اہلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے" بقول جناب کوثر چاندپوری عکس خیال کو دیکھ کر

---

[1] یہ منظوم ترجمہ سازِ مغرب حصہ دوم میں شریک ہے۔

یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ارشاد صدیقی نے اپنے ڈھلے ڈھلائے شعور کی مدد سے انگریزی زبان کے حُسن اور تاثیر کو اردو میں جذب کرنے کی ایسی حسین کوشش کی ہے جسے ناکام نہیں کہا جا سکتا۔ الفاظ کے موزوں انتخاب سے انھوں نے زورِ کلام کو برقرار رکھنے کی پُوری شاعرانہ کاوش سے کام لیا ہے۔

اس سلسلہ میں شان الحق حقی کا مجموعہ کلام "تارِ پیراہن"، بھی لائقِ ذکر ہے جو اُردو اکیڈمی سندھ سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس کا ایک حصہ "بازیافت" منتخب منظوم تراجم پر مشتمل ہے اس میں کچھ بنگالی نظموں کے ترجمے ہیں اور کچھ انگریزی۔ "خوفِ مرگ" اور فرصت[1] اعلیٰ درجہ کے منظوم ترجمے ہیں۔ حقی نے بقول خود "تراجم کے انتخاب میں ہاتھ روک کے رکھا ہے ورنہ سلسلہ دراز تھا"۔ جو ترجمے اس انتخاب میں شامل نہیں ہیں اگر ان کی بھی اشاعت عمل میں آئے تو یقین ہے کہ اُردو ادب میں اچھا اضافہ ثابت ہوں گے۔

"انگلش اردو پوئمس" کے نام سے محمد فضلُ الرحمٰن کے ۲۶ منظوم ترجموں کا انتخاب اورینٹ لانگمینس نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ منظوم ترجموں کی حد تک جناب فضلُ الرحمٰن کی یہ کوشش رہی کہ نہ تو حرف بہ حرف لفظی ترجمہ ہو اور نہ مضمون اصل سے بہت دور جا پڑے بلکہ طرزِ بیان کی عام آزادی کے ساتھ مطلب و معنی کے اظہار میں پُوری پابندی ملحوظ رکھی ہے۔ جناب فضلُ الرحمٰن کے منظوم ترجموں کو یقیناً کامیاب کوشش قرار

---

[1] یہ دونوں منظوم ترجمے سازِ مغرب حصہ دوم میں شریک ہیں۔

دیا جا سکتا ہے اور ان کے منظوم ترجموں کو اُردو ادب میں مستقل مقام دیا جا سکتا ہے۔

اور ایک قابلِ ذکر مجموعہ "نسیم مغرب" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ یہ چھبیس ۲۶ منتخب انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کا مجموعہ ہے جو امیر چند بہار کی کاوشں کا نتیجہ ہے۔ بہار نے منظوم ترجموں کی دشوار گزار منزل کو طے کرنے میں مقدور بھر کوشش کی اور قابلِ لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔ بہار کے بعض منظوم ترجموں کو شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے انگریزی ادب پر عبور ہونے کی وجہ سے ان کے ترجمے اصل سے بہت قریب ہیں۔ بہار نے اُردو ادب کو قابلِ قدر ذخیرہ مہیا کیا ہے۔

انگریزی سے اُردو میں منظوم ترجموں کی روایت تقریباً ایک سو بیس سال پرانی ہے جب کہ غزل کی روایت تقریباً چار سو سال[1] کی ہے اس عرصے میں غزل گو شعراء کے مقابلہ میں جن کی تعداد شمار سے فزوں تر ہے اس جدید اور مشکل صنف میں کم و بیش ایک سو پچاس شاعروں نے خاص توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ طبع آزمائی کی ان کے شہ پارے چند انفرادی مجموعوں

---

[1] غزل اور مطالعہ غزل میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک جگہ دو ڈھائی سو سال اور ایک جگہ تقریباً تین سو سال لکھا ہے لیکن محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ ۱۶۱۲ء) کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کر لینے کے بعد غزل کی روایت چار سو سال کی قرار پاتی ہے۔

اور زیادہ تر ادبی رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں[۱]۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ ایک سو بیس سال کے عرصے میں منظوم ترجموں کا کوئی ایسا انتخاب شائع نہیں ہوا جو اس صنف ادب کے شایانِ شان ہو۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ابھی تک علمی ڈھنگ سے ان شعری ترجموں کی نوعیت ان کے معیار وکردار اور جدید شاعری پر ان کے اثرات کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔

اِس بکھرے ہوئے اور منتشر مواد کو یکجا کرنے۔ اسے دستبرد زمانہ سے محفوظ کرنے اور اہلِ ذوق کی خدمت میں ایک گل دستہ کی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے منظوم ترجموں کا انتخاب ضروری تھا۔

منظوم ترجموں سے مذاقِ سخن کی اِصلاح اور بلاشبہ زبان و ادب کو ترقی ہوئی۔ ان ترجموں نے نہ صرف انگریزی اور اردو دونوں کی بلکہ بین الاقوامی ادب کی خدمت انجام دی۔

منظوم ترجموں سے اُردو زبان کی توانائی ثابت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان شاعری اور موسیقی کے لیے بہت موزوں ہے۔ اور شاعرانہ خیالات اس میں کامیابی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو میں لطیف جذبات وخیالات کے اظہار کی گنجائش ہے۔

---

[۱] ان رسالوں میں قابلِ ذکر مخزن۔ دل گداز۔ دکن ریویو۔ افادہ۔ تمدن تجلی ادیب زمانہ۔ ہمایوں۔ ادبی دُنیا۔ نیرنگ خیال۔ نگار۔ عالمگیر۔ کارواں شاہکار۔ علی گڑھ میگزین اور مجلہ عثمانیہ ہیں۔

منظوم ترجموں کے مطالعہ اور منظوم ترجموں کی تحریک سے واقفیت سے جدید نظم کے ارتقاء اور اس کے مزاج کو سمجھنے میں قابل لحاظ مدد مل سکتی ہے۔ خود صنف غزل پر بھی منظوم ترجموں کا اثر پڑا اور ان کے ذریعہ غزل کی ہیئت میں نئے تجربے ہوئے۔

مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ منظوم ترجموں کے انتخاب کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ دوسری زبانوں میں مختلف موضوعات پر جو سوچا اور لکھا گیا ہے ان سے استفادہ کرنا اور اردو شاعری کو ان موضوعات سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ منظوم ترجموں کے ذریعہ ہمارے شاعروں کو اس امر کی جانب متوجہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری شاعری میں گل و بلبل اور اسی نوعیت کے روایاتی موضوعات سے ہٹ کر بھی بے شمار موضوعات ہو سکتے ہیں جن سے ہماری شاعری کا میدان وسیع اور معیار بلند ہو سکتا ہے۔

اس ضرورت اور کمی کو والا اکیڈیمی نے محسوس کیا۔ سازِ مغرب کو اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا پراجکٹ قرار دیا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات ہمارے لئے موجب فخر ہے۔

غیر زبانوں سے اردو میں کئے گئے منظوم ترجموں کو بلاشبہ اردو شاعری کی ایک علیحدہ اور مستقل صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس صنف سے اس وقت تک بے اعتنائی برتی ہے اور روا انصافی کی ہے۔ ہم نے اس کو وہ توجہ اور اہمیت نہیں دی جس کی وہ بدرجہ اولی مستحق ہے۔ اور نہ ہی اس صنف کے صحیح مقام اور مرتبہ کو متعین کرنے کی ایسی

خاص اور بااصولی کوشش کی گئی جس سے اس صنف کے انفرادی اور جمالیاتی پہلوؤں کے خط و خال کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔ ضرورت ہے کہ اس جدید صنف ادب کے مطالعہ پر زیادہ توجہ دی جائے۔ اگر سازِ مغرب کی اشاعت سے اس صنفِ ادب پر خصوصی توجہ دینے کے امکانات روشن ہوتے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

وِلا اکیڈیمی کا منصوبہ ہے کہ سازِ مغرب چھ حصّوں پر مشتمل ہو۔ پہلا حصہ ستمبر ۱۹۷۶ء میں دوسرا اپریل ۱۹۷۷ء اور تیسرا جنوری ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ ان تینوں میں انگریزی نظموں کے ایسے تراجم کا انتخاب شریک ہے جو قدیم نظم نگاری کے طریقوں پر کاربند رہتے ہوئے روایاتی انداز کی نظم میں کئے گئے ہیں اور جن میں بحر و قوافی کی پابندی کی گئی ہے۔ البتہ ان نظموں میں ہیئت اور اسلوب کے دلچسپ تجربے ضرور کئے گئے ہیں۔
چوتھے حصہ میں جو اب پیش خدمت ہے ایسے ہی منظوم ترجموں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے اور پانچویں حصہ میں بھی ایسے ہی منظوم ترجموں کا انتخاب شامل کیا جائے گا۔ چھٹے حصہ میں انگریزی نظموں کے ایسے منظوم ترجموں کا انتخاب شامل کیا جائے گا جو نظم معریٰ (بلینک ورس) اور نظم آزاد میں لکھی گئی ہوں۔ اسی حصہ میں انگریزی کے علاوہ دوسری مغربی زبانوں کے منظوم ترجموں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ اس کے بعد دو مجموعے سازِ مشرق کے نام سے پیش کئے جائیں گے۔ ایک میں فارسی سے اُردو میں کئے گئے منظوم ترجمے شامل ہوں گے۔ اور دوسرے میں سنسکرت اور دوسری ہندوستانی

زبانوں و نیز چینی جاپانی اور عربی کی نظموں کے نمائندہ منظوم ترجمے شامل ہوگئے۔
ساز مغرب حصہ اول میں ۳۳ اردو شاعروں کی ۴۷ نظمیں شامل تھیں حصہ دوم میں ۵۴ شاعروں کی ۸۰ نظمیں اور حصہ سوم میں ۴۶ شاعروں کی ۴۰ نظمیں پیش کی گئی تھیں۔ اس مرتبہ (۶۲) شاعروں کے (۱۳۸) منظوم ترجمے شریک اشاعت ہیں۔
بعض ناگزیر مجبوریات کی بنا پر حصہ دوم میں منظوم ترجموں کے مقابل اصل انگریزی نظموں کو پیش نہ کیا جا سکا تھا۔ البتہ حصہ سوم میں تمام منظوم ترجموں کے ساتھ اصل انگریزی نظموں کو شریک اشاعت رکھا گیا تھا۔ اس مرتبہ (۲۸) انگریزی نظمیں شریک اشاعت ہیں جن منظوم ترجموں کے اصل حصہ اول یا حصہ سوم میں شریک ہیں ان کی فہرست بھی شریک اشاعت ہے۔ منظوم ترجمہ کے آخر میں اگر وہ کسی رسالہ سے لیا گیا ہے تو رسالہ کا نام اور شمارہ کا ماہ و سال درج ہے۔ ورنہ جہاں تک تعین ہو سکا منظوم ترجمے کی تصنیف کا سنہ درج ہے۔
مرتب کو حق نہیں پہونچتا کہ وہ عظیم فن کاروں کی جانب سے کوئی اعتذار پیش کرے۔ لیکن ترجمہ بذات خود کوئی آسان کام نہیں ہے۔ شاعری کا ترجمہ اور وہ بھی منظوم دشوار ترین کام ہے۔ پھر تمام پابندیوں اور دشواریوں کا لحاظ کرتے۔ جو کامیابی ان ترجموں نے حاصل کی ہے۔ اس پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ترجمے خلوص محض کے بغیر وجود میں نہ آتے۔ شاعر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مسعود حسن ادیب کے الفاظ میں کہہ رہے ہوں۔

"حرف گوئی کہتی ہے کہ جو ہو نہ سکے اس کی ہوس کیوں کی جائے اپنی زبان کو سنوارنے کا شوق جواب دیتا ہے کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ ایسا گوہر بے بہا ہاتھ آئے اور میں اسے اردو کے دامن میں ٹانک نہ دوں۔ کیا عجب کہ ادبی جواہر کے پرکھنے والوں کو کہیں کہیں اس کی اصلی چمک دمک نظر آجائے۔"

یقین ہے کہ ناظرین کو یہ چمک دمک نظر آئے گی۔

سی ۲۰۷ کرزن روڈ اپارٹمنٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
مارچ ۱۹۷۸ء

حسن الدین احمد
صدر ولا اکیڈیمی

حسب ذیل منظوم ترجموں کی اصل انگریزی نظمیں حصہ اول میں موجود ہیں

حسب ذیل منظوم ترجموں کی اصل انگریزی نظمیں حصہ سوم میں موجود ہیں

نیاؔز فتح پوری

تیر و نغمہ

ایک جو سما میں تیر پھینکا میں نے
لیکن وہ کہاں گرا؟ نہ دیکھا میں نے
اس درجہ سریع و تیز تھا اس کا رم
نظریں مری ہو سکیں نہ اس کی ہمدم

اک شعر ہوا میں میں نے چھوڑا گا کر
معلوم نہیں کہاں وہ ٹھہرا جا کر
ہے کس کی نظر کی تیز ایسی پرواز
جو نغمہ کی ہو سکے ہوا میں دمساز

ایک عرصہ کے بعد تیر آیا وہ نظر
اک نخل بلوط میں چھپا تھا جا کر
وہ شعر بھی مل گیا مجھے مجمل میں
پیوست تھا میرے اک محب کے دل میں

ارشد صدیقی

تیر و نغمہ

میں نے اک تیر خلاؤں میں کہیں پھینکا تھا
وہ کہاں جا کے گرا یہ مجھے معلوم نہیں
اس کی رفتار کی تیزی کو نظر کیا پاتی
رہ گئی کھینچ کے تخیّل میں فقط ایک لکیر
میں نے اک نغمہ فضاؤں میں کبھی چھیڑا تھا
وہ کہاں جا کے رُکا یہ مجھے معلوم نہیں
کس کی نظروں میں ہے وہ قوت پرواز کہ جو
کر سکے نغمۂ شاعر کی بلندی کو اسیر
بعد مدّت کے جب آیا مجھے وہ تیر نظر
میں نے اک نرم شجر میں انھیں پنہاں دیکھا
اور وہ نغمہ جو چھیڑا تھا فضاؤں میں کبھی
اپنے اک دوست کے سینے میں فروزاں دیکھا

تسکین سوروتوی

ناوک و نغمہ

میں نے پھینکا ایک ناوک جب ہوا پر بے خطر
وہ کہاں جا کر گرا اس کی نہیں مجھ کو خبر
وہ سبک پروازی اس کی جس سے خود اپنی نظر
ٹھوکریں کھاتی رہی رہ رہ کے ہر ہر گام پر

میں نے گایا ایک نغمہ اس فضا میں دوڑ کر
وہ کہاں گونجا ملا اس کا نہ مجھ کو کچھ اثر
کونسی وہ آنکھ ہے جس کی نظر ہے اتنی تیز
جو شش رفتار اس کی دیکھے ہنگام گریز

ہائے جب دنیا نے لے ڈالیں ہزاروں کروٹیں
میں نے پایا اپنا ناوک ایک بیخ نخل ہیں
اور وہ نغمہ ملا اول سے آخر تک تمام
در دل یارے کہ آنرا بود از و تسکیں مدام

مولانا امتیاز علی عرشی

نجم درخشاں

جگ مگ جگ مگ ہونے والو
اتنی بلندی پر دُنیا سے
ہیں یہ روشن ہیرے کیسے
محو حیرت ہوں بتلاؤ

روشنی اپنی مہر درخشاں
جب مغرب میں لے جاتا ہے
تم میں اُجالا تب آتا ہے
اور شب بھر رہتے ہو تاباں

چلنے والے تاریکی میں
ہوتے ہیں ممنون تمہارے
شب بھر گر تم چمکو نہ مارے
راستے اپنے کیسے پائیں

۱۹۲۵ء

محی اُلدّین

ننھے تارے

چمکتے ہوئے ننھے ننھے سے تارو!
بتاؤ مجھے تم ہو کیا چیز پیارو
بہت اُونچے تم آسماں پر ہو رہتے
وہاں مثل ہیرے کے تم ہو چمکتے
چمکدار سُورج ہے جب مُنہ چھُپاتا
اندھیرا ہر اک چیز پر جب ہے چھاتا
چمک تھوڑی سی تم ہو اُس دم دکھاتے
اندھیرے میں جُگنو سے ہو جگمگاتے
مُسافر کوئی گر ہے اس وقت جاتا
تمہاری چمک سے ہے وہ راہ پاتا
اگر تم چمکتے نہ ہو آسماں پر
پہنچتا وہ کس طرح منزل پہ جاکر؟

رہا کرتے ہو نیلگوں آسماں پر
ہو مجھ پر نظر ڈالتے جھک کے اکثر
نہیں آنکھ کو ایک پل بند کرتے
جب تک کہ مشرق سے خورشید نکلے
تمہاری چمک اور ننھی ضیا سے
مسافر اندھیرے میں ہیں راہ پاتے
نہیں مجھ کو معلوم تم چیز کیا ہو؟
چمک کر مگر شان اپنی دکھاؤ

عزیز نظمی

تارے

جِھل مل جھل مل ننھے تارو — ہوں میں حیراں پھر تم کیا ہو
دور بہت دُنیا سے اُوپر — ہیرے چمکیں اوجِ فلک پر

جب کہ تپتا سورج ڈوبے — اس دم کوئی چیز نہ چمکے
تب تم دیتے رونق ہلکی — جِھل مل جِھل مل رات ہو ساری

راہ اندھیری راہی بھٹکا — شکر تمہاری ننھی چمک کا
کہہ نہیں سکتا جائے کدھر وہ — تم نہ اگر یوں جھل مل چمکو

گہرے نیلے چرخ پہ رہ کر — پھر پردوں سے جھانکو اکثر
موندو گے بھی کبھی یہ آنکھیں — جب تک سورج رہے گگن میں

جوت تمہاری ننھی چمک سی — چمکیں راہیں سب اندھیاری
میں نہ جانوں پھر تم کیا ہو — جھل مل جھل مل ننھے تارو

محی الدین

ننھا پودا

بیج کے دل کی گہرائی
پیارا پیارا ننھا پودا
نیند کا ماتا پیارا پودا
گہری نیند پڑا تھا سوتا
دھوپ یہ بولی "جاگو جاگو
نُور کی دُنیا کو بھی دیکھو"
بارش کے چمکیلے قطرے
"جاگو ، اٹھو، جاگو" بولے
ننھے پودے نے بھی سُن لیں
آوازیں جو سب نے دی تھیں
نیند سے جاگا اٹھ کے دیکھا
دُنیا کا یہ رنگ نرالا

مولانا امتیاز علی عرشی

شجر نوخیز

قلب میں تخم سخت پنہاں کے
خواب شیریں کے لے رہا تھا مزے
ایک ننھا سا دل رُبا پودا
گرمیٔ آفتاب تاباں نے
قطرہ ہائے یمِ درخشاں نے
"جاگ، آ روشنی میں" اُس سے کہا
ننھے پودے نے جب صدا یہ سنی
دیکھنے کارگاہ بیرونی
کس قدر ہے عجیب، اُٹھ بیٹھا

حالیؔ

قدر و منزلت کس جگہ ہوتی ہے؟

موتی ہزار، قعرِ سمندر میں ہوں نہاں
پر یہ بتاؤ ان کا خریدار ہے کہاں
کھلتے ہیں پھول سینکڑوں ویران دشت میں
ہے کون رنگ و بو کا وہاں اُن کے قدرداں؟

فضل الرحمن

خانہ نشین

مختصر کھیت مختصر سا گھر
فکر دولت نہ آرزوئے زر
اپنے پیارے وطن میں خانہ نشیں
چین کا سانس لے جو گوشہ نشیں
بھیڑ بکری زمیں لباس اناج
کسی شے کے لئے نہیں محتاج
گرمیوں میں درخت سایہ دار
جاڑوں میں آگ تاپنے کی بہار
روز و شب صحت اور راحت کے
سال و مہ انبساط و عشرت کے
رات کے نعمت خواب کی دنیا
دن کو علم و کتاب کی دنیا

حکمت و فلسفہ کی گہ تشریح
بذلہ سنجی کبھی کبھی تفریح

زندگی میں نمود و نام یہاں
نہ پس مرگ کوئی مرثیہ خواں

نہ کسی کو ملے لحد کا پتہ
نہ کہیں لوح قبر کا کتبہ

نظم طباطبائی

نغمۂ زندگی

کیوں کہتا ہے ہر بار ہو کر غمگین
"ہستی ہے ہیچ دار دُنیا ہے خراب
آتا ہے نظر سب کچھ، ہے کچھ بھی نہیں
گویا دل مُردہ دیکھتا ہے اک خواب"
یہ خوب سمجھ لے کہ ہے ہستی بے شک
مرقد ہرگز نہیں ٹھکانا اپنا
مٹی کا ہے جسم، ہوگا مٹی بے شک
ہم اور ہیں اور ہی فسانا اپنا

خوشیاں دُنیا کی اور دُنیا کے ملال
مقصود ہمیں وہ، نہ یہ مطلوب ہمیں
ہاں چاہیئے وہ روش کہ ہو جائیں نہال
دن آج کا گذرے کل سے بھی خوب ہمیں

کرنے ہیں بہت سے سانگ اور رات ہے کم
اور دیکھتے ہیں جب اپنے ہم دل کی طرف
نقارہ ہے اک کہ بج رہا ہے پیہم
یعنی ہے سفر گوز کی منزل کی طرف

اس معرکہ میں کہ نام جس کا ہے جہاں
اس مرحلہ میں سلسلہ جنباں ہوکر
کولھو کا نہ بن بیل کہ تو ہے انساں
میداں سے گزر تو مرد میداں ہوکر

آئندہ دُنیا کو بھروسہ کس کو
ماضی ہے سو مردہ ہے اُسے آگ لگا
ہاں حال میں کر گزر جو کچھ کرنا ہو
ہمت گر دل میں ہے تو سر پر ہے خدا

تاریخ کو رفتگاں کی پڑھ کر ہر دم
ہم بھی تو کریں انھوں نے جو کام کئے
جولاں گہ دہر سے اٹھائیں نہ قدم
بے نقش ہٹائے ہوئے بے نام گئے

شاید کوئی عزیز گم کردہ سبیل
سر گشتہ و پا شکستۂ وادیِ دہر
دیکھے جو ہمارے نقش پا مثل دلیل
ہمت کرے، منزل کی پھر آئے اسے لہر

آنکھیں کھولو اٹھو کمر کو باندھو
اب پائے طلب رُکے نہ اب دست سوال
انجام اس سعی کا جو ہونا ہو سو ہو
کا سب کو کمال چاہئے استقلال

ہمت جب حصہ اول صفحات ۵۴ و ۵۵ حصہ دوم صفحہ ۱۲۸ ۔ اور حصہ سوم صفحات ۶۵ ، ۶۸ و ۱۲۸ پر دیکھئے ۔

محمد عثمان عارف نقشبندی

چل جاڑے کی ہوا چل

خوب چل جاڑے کی برفیلی ہوا کتنی ہی چل
تیری بے مہری کے نشتر ہیں، وہ شامل ہے کہاں
زہر قاتل جو ہے احسان فراموشی میں

(۲)

ٹھنڈی سانسوں سے تری گل ہی ہی شمعِ حیات
سرد ہوتے نہیں احساسِ شرافت پھر بھی
تو نگاہوں سے ہے اوجھل تو سمجھتے ہیں یہی
تیرے دندان ستم تیز ہیں تیز نہیں
ظلم مت پوچھ مگر مجھ سے تو اُن نظروں کا
دیکھتے دیکھتے جو اجنبی ہو جاتی ہیں

(۳)

برف ا ہاں برف گرا، چرخِ ستم گار گرا
تیر بن بن کے لگیں چاہے ہوا کے جھونکے

زخم ایسے تو نہیں آئیں گے میرے دل پر
جیسے انسان کی اس فطرتِ ناشکری سے
پھول کے بدلے میں جو زخم دیا کرتی ہے

(۴۳)

میرے جیون کے وشال اور اتھاہ ساگر میں
غم کے طوفان اٹھاتی ہوئی موجو! یہ سنو
تم جو ڈھاتی ہو قیامت، وہ قیامت تو نہیں
جو بھلا دینے سے، اک دوست کے دل پر گذرے

ہم ترجمہ حصہ سوم صفحہ ۲۴۲ پر دیکھیے۔

فضل الرحمٰن

محبت کا فلسفہ

ندیوں کے دل روئے دریا پر نثار
جان دریاؤں کی بحرِ کنار

مل کے آپس میں ہوائیں مست ہیں
آسمانوں میں فضائیں مست ہیں

کوئی شے یاں یکّہ و تنہا نہیں
ربط باہم گر نہ ہو دُنیا نہیں

ذرّے ذرّے میں محبت کی کشش
عشق ہے قانون فطرت کی کشش

کس لئے رہتے ہیں پھر ہم تم جُدا
کیوں نہیں مٹتا دوئی کا تفرقہ

چومتے ہیں آسماں کو کوہسار
چاہ میں موجوں کی موجیں بے قرار

یوں گلے لگتے ہیں گلہائے چمن
جیسے آپس میں ملیں بھائی بہن

پرتو خاور زمیں سے ہم کنار
ذرّے خورشید مبیں سے ہم کنار

چاند کی کرنیں شب خاموش میں
کھیلتی ہیں بحر کی آغوش میں

کس لئے فطرت کا یہ بوس وکنار
لعل لب تیرے نہ ہوں جب بوسہ بار

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

قلق میرٹھی

لڑکپن کی پہلی مصیبت

آہ پھر بھائی کو مرے بلواؤ
مجھ کو اور اس کو ایک جا کھلواؤ
گل کھلے بر اڑے بہار آئی
ہے بناؤ کہاں مرا بھائی
تتلیاں کرنوں میں چمکتی ہیں
کیسی کیسی عجب دمکتی ہیں
ان کے پیچھے میں دوڑتا ہی نہیں
ہاں بلادو جو بھائی ہووے کہیں
ہم نے کچھ جو کہ پھول بُوئے تھے
گرد اشجار باغ سب وہ اگے
شاخ ہائے درخت میں انگور
بوجھ سے جھک رہے ہیں پاس اور دور

آہ اس کو بلائے تو کوئی
ہے وہ کس جا بتائے تو کوئی

میرے پیارے نہیں وہ سناصدا
پاس بھی اب نہیں وہ آسکتا

خندہ زن جوں بہار وہ چہرہ
پھر زمیں پر نظر نہ آئے گا

زندگی، خرمی کی اور شباب
دی گئی تھی اسے جو گلاب

جا کے تو کھیل اے پسر تنہا
باغ جنت میں ہے ترا بھیّا

پھولوں چھڑیوں کو اس نے چھوڑ دیا
میری بے فائدہ ہے اس کو ندا

گرمیوں کے دنوں میں بھی کیا دو
کھیلنے آئے گا نہیں لوگو

مرغ زار اور چشمہ ساروں پر
ساتھ پھرتا ہوا وہ سب آخر

آہ جب بھائی ساتھ کھیلتا تھا
کاش میں خوب پیار کر لیتا

ہمترجمہ حصّہ اول صفحہ ۱۱۹ پر دیکھئے۔

برق دہلوی

مادرِ ناشاد کا خواب

اے مری آنکھوں کے تارے تو کہاں ہے جلوہ گر
چاند سی صورت تری آتی نہیں مجھ کو نظر
فرطِ غم سے ہوں پریشاں حال میں تیرے لئے
اشکِ خوں روتی ہوں میرے لال میں تیرے لئے
تیرے ہی دم سے میسر تھا مرے دل کو سرور
شکل زیبا تھی تری تسکین جانِ ناصبور
آہ مرے لال مجھ کو داغِ ہجراں دے گیا
تادمِ آخر مجھے جلنے کا ساماں دے گیا
اے مرے نورِ نظر اے مایۂ صبر و شکیب
میری آنکھوں میں ہے اب تک تری شکلِ دلفریب
روتی ہوں آٹھ آٹھ آنسو تیری خاطر روز میں
کھینچتی ہوں تیرے غم میں نالۂ جاں سوز میں
تو چراغِ خانماں تھا، دل تھا پروانہ مرا
تیرے ہی دم سے بیتر تھا سیہ خانہ مرا

ترا پیکر اب مجھے نقشِ خیالی ہوگیا
آہ میرا حلقۂ آغوش خالی ہوگیا
ہاتھ بھی تیرے نہ ٹوٹے آہ گلچینِ اجل
تو نے میرا غنچۂ نوخیز توڑا بے محل

اس کو ہاتھوں چھاؤں میں رکھتی تھی مرگِ ناگہاں
کر دیا گل تیرے جھونکے نے چراغِ خانماں
روتے روتے سو گئی اک روز وہ ناشاد ماں
رات دن ماتم میں جو رہتی تھی سرگرم فغاں

اس کو اُس دم اک فرشتہ خواب میں آیا نظر
کھل گئی آنکھیں سی جس کا روئے انور دیکھ کر
وہ فرشتہ یوں ہوا گویا کہ اے ناشادِ غم
کس کی خاطر ہو رہی ہے اس طرح بربادِ غم

کس کی فرقت کا صدمہ، جان ہے کس میں پڑی
لگ رہی کس کے لئے آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی
سرد آہیں کس لئے بھرتی ہے تو اے غم نصیب
چھٹ گیا ہے تجھ سے آخر کون سا ایسا حبیب

بھر کے آہِ سرد یوں گویا ہوئی وہ بے قرار
حالِ دل تجھ سے کہوں کیا، غم سے سینہ ہے فگار
آہ گلچینِ اجل نے مجھ پہ توڑا ہے ستم
اُس کے ہاتھوں لٹ گیا، میرا گلستاں یک قلم

جل گیا میرا گلِ رعنا، خس و خاشاک میں
مل گئیں افسوس میری آرزوئیں خاک میں

سُن کے یہ بولا فرشتہ اس سے میرے ساتھ آ
میں بتاؤں یوسفِ گم گشتہ کا تیرے پتا
پھر وہ اس مہجور کو باغِ جناں میں لے گیا
بلبلِ شیدائے گل کو گلستاں میں لے گیا

دیکھتی کیا ہے کہ ہے اک بوستانِ نوبہار
جس میں میووں کے شجر ہیں پھول پھل سے باردار
کر رہی ہے عطر افشانی نسیم جاں فزا
آ رہی ہے خندۂ گل سے نسیمِ جاں فزا
زینت افزائے چمن گلہائے رنگارنگ ہیں
شاخِ گل پر نغمہ زن مرغانِ خوش آہنگ ہیں
پھول ایسے خوش نما ہیں گلشن شاداب میں
چشمِ نظّارہ نے جو دیکھے نہ ہوں گے خواب میں
وسطِ صحنِ باغ میں ہے ایک دلکش سبزہ زار
جا بجا ہیں محوِ گل بازی ہزاروں شیر خوار
شوق سے ان پھول سے بچوں پہ دوڑاتی نظر
پر نظر آیا نہ ان میں اپنا آرام جگر

پھیریں آنکھیں ادھر سے بادلِ حسرت طلب
دوسری جانب نظر ڈالی بصد رنج و تعب
دیکھتی کیا ہے وہاں ہے ایک ایوانِ بلند
اور اترتا ہے اسی سے نورِ دیدہ ارجمند
جوشِ اُلفت میں کلیجہ سے لگایا دوڑ کر
لیں بلائیں اور دیئے بوسے جبینِ ناز پر
پھر کہا اس سے کہ اے آرام جانِ بے قرار
جاں بلب تری جُدائی سے ہوں میں سینہ فگار
رات دن ماتم میں شغلِ اشک باری ہے مجھے
تو جدا جب سے ہوا ہے جان بھاری ہے مجھے
رنج کھانے کے لئے ہے اشک پینے کے لئے
آب و دانہ ہے یہی فرقت میں جینے کے لئے
تیرے غم میں چشم کو پرنم کیا کرتی ہوں میں
دستِ مژگاں سے ترا ماتم کیا کرتی ہوں میں
ہاں مرے نورِ نظر بہر خدا منہ سے تو بول
کیوں ہے دستِ نازنیں میں کھولتے پانی کا ڈول
اور بچے تو ہیں سب معروفِ گلبازی وہاں
تو اسیرِ رنج و غم ہے کس لئے تنہا یہاں
تجھ سے کیا ایسی خطا سرزد ہوئی ہے جانِ من
جس کی تو پاداش میں ہے یوں گرفتارِ محن

بھر کے آہِ سرد یوں بولا وہ طفلِ نازنیں
کیا بتاؤں کس بلا میں ہے مری جانِ حزیں
جان پر صدمہ ہے میری اشک باری سے تری
مضطرب ہے روح میری، بیقراری سے تری
جوشِ الفت میں بہاتی ہے جو تو اشکِ رواں
فرطِ غم سے غیر ہوتی ہے مری حالت یہاں
یاد کرتی ہے جو تو ہوتا ہوں میں بھی بے قرار
کھینچتا ہے دل کو تیرا جذبۂ بے اختیار
آنکھ سے ٹپکے ہیں ترے گرم آنسو کس قدر
قطرہ قطرہ جمع ہیں اس ڈول میں وہ سر بسر
تو نہ رویا کر مرے ماتم میں اے ناشاد ماں
سونپ دے مجھ کو خدا کے ہاتھ ہو کر شادماں
پھر نہ ہوگی روح میری جوشِ غم سے بے قرار
پھر دلِ مضطر نہ ہوگا، یوں الم سے بے قرار

سن کے بولی مادرِ ناشاد اے نورِ نظر
ہرے رونے سے اگر صدمہ ہے تری جان پر
اب نہ روؤں گی ترے سر کی قسم کھاتی ہوں میں
جبر کر کے اس دلِ مضطر کو سمجھاتی ہوں میں
تجھ کو یوں راحت ملے تو اے گلِ نخلِ مراد
سونپتی ہوں میں خدا کے ہاتھ تجھ کو شاد شاد

سنتے ہی یہ پھینک کر بارِ گراں طفلِ حسیں
دوڑ کر پہنچا جہاں تھے گُلِ رخان نازنیں
ہو گیا وہ محوِ گل بازی بصد لُطف و خوشی
مادرِ ناشاد کے بھی کھل گئی دل کی کلی
کُھل گئی چشمِ تماشا خواب سے بھی ایک بار
پر رد پہلو میں دلِ مضطر کو پایا بے قرار
تا دمِ آخر مگر باقی رہی تاثیرِ خواب
نقشِ تسکینِ دل مضطر ہوئی تعبیر خواب

ہمترجمہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۵ پر دیکھیے۔

فضل الرحمٰن

من کا پیار

میرا پیارا سُرخ گلاب ہے
وہی رنگ اور وہی آب ہے
میرا پیار گیتوں میں گیت وہ
نہیں جس کا کوئی جواب ہے

تیرا مکھڑا حُسن کا ہے چمن
ترا روپ رنگ میں یاسمن
مری چاہ کی نہ تو حد نہ نہ
مرا من ہے جیسے کہ تیرا من

جو ہوں خشک سات سمندر اب
نہ ہو اک پہاڑ زمیں پر اب
نہ مٹیں گے داغوں کے یہ چمن
نہ رکیں گے آنسو کے گوہر اب

کبھی پھر ملیں گے اے دلربا
دل و جاں کا تجھ سے ہے آسرا
میں دوبارہ لوٹ کے آؤں گا
جو ہو دو جہاں کا بھی فاصلہ

کیدارناتھ بکل دہلوی

تتلی

ہوئی ہے نصف ساعت دیکھتے اے خوشنما تتلی
تجھے بیٹھے ہوئے اس زرد گل پر واہ وا تتلی

مگر بے حس ہے تو جو، در حقیقت مجھکو حیرت ہے
کہ کھاتی ہے، کہ سوتی ہے، کہ مشغول عبادت ہے

تعجب کیا جو دیکھے بجر یخ بستہ میں جنبش ہو
مگر کیا تاب تیرے تخت گل پر ہے تزلزل کو

صبا کیوں تجھ کو کنجِ گل سے اے پیاری اڑا لائی
کوئی کیا طرفہ تر لذّت ہے چشم شوق میں پائی

چمن یہ لہلہاتے اور سبزہ زار تیرے ہیں
تجھے پھر خوف کس کا ہے گل واشجار تیرے ہیں

مزے سے آکے کنج عافیت میں تو بسیرا لے
یہ ننھے ننھے پر، پرواز سے ماندہ ہیں سستا لے

بھلا میں اور تجھے تکلیف پہونچاؤں معاذ اللہ
ارے اس شاخ پر آ بیٹھ، یا وحشت، یہ ڈر کیسا

یہاں ہم اور تم مل کر کوئی نغمہ اڑائیں گے
فسانہ پھر بہارِ جاں فزا کا ہم سنائیں گے

سنائیں گے تجھے ایامِ طفلی داغ حسرت سے
کہ گذرا آہ! وہ شاہی زمانہ کتنی عجلت سے

توقف کر میرے نزدیک چندے تجھ پہ شیدا ہوں
تجھے آسر پہ، آنکھوں میں، جگر پہ دل پہ بٹھلاؤں

ترے دیدار سے ایامِ رفتہ یاد آتے ہیں
زبانِ حال سے اسٹوریاں مجھ کو سناتے ہیں

نہ لے نام جدائی آ، تری آنکھوں کا سرمہ ہو
تجھے میں دیکھ کر روتا ہوں ایامِ گذشتہ کو

ترے جلوے سے اے کانِ نزاکت وہ مزہ آیا
کہ سب ناز و نعیم بچپن کا اپنے مجھ کو یاد آیا

خوشا وہ عہدِ طفلی! آہ کیسے لطف کا سن تھا
کہ جس میں کھیلنے سے کام ہم کو رات اور دن تھا

خوشا وہ وقت جب میں اور مری ہمشیر نیک اختر
نہایت شوق سے باغوں میں کھیلا کرتے تھے ملکر

پکڑنے کو تجھے شام و سحر سرگرم رہتے تھے
نہایت کوششیں کرتے تھے اور تکلیف سہتے تھے

جھپٹنا میں کبھی مثلِ شکاری ساتھ تھا تیرے
کبھی جھاڑی میں سبزہ سے کبھی سبزہ پہ چھاؤں سے

مگر تھی مری یادش بخیر، اس درجہ نازک تھی
کہ ہرگز خوفِ زحمت سے ترے بازو نہ مس کرتی

نہ دیتی پوچھنے بازوے گرد آلود بھی تیرے
تری ننھی سی جان کو تا نہ کچھ رنج و تعب پہونچے

نزاکت رنگ و روغن اس قدر تیرا پیارا تھا
کہ ہو جاتی تھی بیکل، اور نہ چھونا ہی گوارا تھا

رسالہ "زمانہ" کانپور مارچ ۱۹۱۲ء

اختر جونا گڑھی

بی بی حوّا آدم سے کہتی ہیں

ہے کیسی مفرح یہ ٹھنڈی ہوا
ہے دل چسپ کیسا سحر کا سماں
لکھنا وہ گلہائے خوش رنگ کا
ترو تازہ ہوں جس سے روحِ رواں
وہ مرغ خوش آہنگ کے چہچہے
وہ اڑ اڑ کے جانا یہاں سے وہاں
لپٹ جانا وہ شاخ کا شاخ سے
وہ غنچوں کے لب سے تبسمیاں
جوانانِ گلشن کی وہ چھیڑ چھاڑ
عروسانِ گلشن کی اٹھکھیلیاں
وہ ہلکی سی بوندوں کی پڑنا پھوار
ہو خاک زمیں جس سے عنبر فشاں

چمکنا شعاعوں کا تالاب میں
وہ امواج کا ہونا اخترفشاں
وہ پر لُطف لیلائے شب کا ورود
وہ راحت فزا چاندنی کا سماں
چمکتے دمکتے ستاروں کا نور
ہو جس سے منور یہ سارا جہاں
وہ مخلوق کا ایک ایسا سکوت
کہ کانوں کو اک ہوں بھی گذرے گراں
شگفتہ مگر دل کو تیرے بغیر
کریگی نہ ہرگز یہ دل چسپیاں

فضلُ الرحمٰن

دانائے راز

چلے چل اے دل زندہ پس شب صبح تابندہ
سفر کی آخری منزل نشان قدرت کامل
لڑکپن اور جوانی کیا ادھوری زندگانی کیا
حوادث سے نہ گھبرا تو خدا پر رکھ بھروسہ تو
تجھے کیا کوئی متوالا چمن کا چاہنے والا
گُلاب و لالہ پر ریجھے فلک کی زہرہ پر ریجھے
مجھے کیا زہرہ سے بڑھ کر حسینوں میں کوئی دلبر
سراپا شعلہ پیکر ہو ستاروں سے حسیں تر ہو
اُمید و بیم کے لمحے شباب و حُسن کے عشوے
میں اور اس عیش کا شکوہ ارے توبہ ارے توبہ
یہ وہ اندیشہ حکمت کا وہ نکتہ علم فطرت کا
نہیں جس میں وہ انگارہ وہ دل ہے سنگ ناکارہ

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

ہنسی آتی ہے رہ رہ کر — غرور اہل دُنیا پر
یہ خبط اسباب عشرت کا — جنوں یہ کسب دولت کا
یہ دعوت زیست کی دو دن — یہ عیش و خوش دلی دو دن
دل ابلہ عقل نابینا — بہائم کا ہے یہ جینا
مقام شادمانی ہے — خدا کی مہربانی ہے
کرم ہے اپنے مالک کا — وہ مالک وہ سخی داتا
وہ شعلہ اور شرر ہیں ہم — وہ جلوہ اور نظر ہیں ہم
سوا اس کے ہمارا کیا — ہم اس کے ہیں ہمارا کیا
تو پھر بھونچال آنے دے — زمیں کو تھرتھرانے دے
گذر ہر رہگذر سے تو — ہر اک راہ خطر سے تو
نہ رک چھالوں سے گھبرا کر — نہ خار رہ کی پروا کر
بلا سے زیست اگر ڈس لے — دہان زخم سے ہنس لے
وہ انساں ہو جو تن پرور — بہائم سے ہے وہ بدتر
جہاں میں جس کی ہر خواہش — ہے وجہ صد کد و کاوش
ہو جس کی روح کا منشاء — مسلسل حرکت اعضاء
نہ بھولے وہ کہ یہ رشتہ — دو روزہ ہے تن و جاں کا
یہ اجزا جسم انساں کے — گلابی پھندے ہیں جاں کے
زبستی ہے ہو راحت کو — شبانہ روز عشرت کو
یہ حیوانوں کے بھی دل ہے — انہیں بھی عیش حاصل ہے

بشر ہونے کا ہے دعوےٰ　　تو رکھو مقصد اعلےٰ

شکایت نفس کی بے جا　　ہوس کا شکوہ بے ہودہ

طیور خوش نوا جیسے　　کریں سیر فضاء جیسے

تو کر پرواز ہر جانب　　ہر اچھی شے کا ہو طالب

تن و جاں متّحد باہم　　سدا ہم صحبت و ہمدم

مبارک موسم پیری　　خرد پرور دم پیری

ثمر میری جوانی کا　　یہ حاصل زندگانی کا

قریب آئے جو یہ منزل　　ہے میری آرزوئے دل

بنوں حیواں سے انساں ہیں　　شبیہ ذات یزداں ہیں

کروں آرام تھوڑا سا　　ہے وقت شام تھوڑا سا

سفر کا وقفۂ راحت　　ہیں جس کے بعد ہر ساعت

بقا کے مرحلے تازہ　　نئے دن مشغلے تازہ

مصاف نو نئی کوشش　　نئے دشمن سے آویزش

گزر لے جب شباب اپنا　　کروں گا پھر حساب اپنا

مسائل نفع و نقصاں کے　　مشاغل ہیں جوانساں کے

کہ جل کر راکھ ایندھن ہے　　تپے سونا تو کندن ہے

جوانی تو ہے دیوانی　　دم پیری ہمہ دانی

سنو چھپتا ہے سورج جب　　گلے ملتے ہیں روز و شب

اجالے ہوتے ہیں رخصت　　تو ایسے میں پھر اک ساعت

صدا آتی ہے مغرب سے — فلک والوں کی جانب سے
"پرکھ اس کو جو دن گذرا — کہ آساں یا کٹھن گذرا"
گھڑی بھر ہٹ کے میداں سے — غم ہستی کے ہیجاں سے
ذرا دُنیا کو دیکھوں تو — حقیقت کیا ہے سمجھوں تو
غلط نکلے وہ اندیشے — صحیح یہ دل کے اندازے
یونہی ہر شام دو شنبہ — کروں فردا کا تخمینہ
جوانی جوشش طوفاں — دم ہنگامہ و ہیجاں
عمل پر دل سے آمادہ — سدا کوشش کی دلدادہ
بڑھاپا فکر پر مائل — دل و بحث کا قائل
بخیر انجام ہے آخر — اجل کا جام ہے آخر
حکم ہے کون فطرت کا — محبت اور نفرت کا
ہر اک کا ذوق الگ سب سے — ہر اک کا شوق الگ سب سے
جدا ہر ایک کی خواہش — ہر اک کی مختلف کوشش
صداقت کس کے ہے بس میں — یہی ہے بحث آپس میں
عمل کی یہ دوکاں داری — یہ سستی قدر بازاری
عبث یہ کام دُنیا کے — صلے انعام دنیا کے
یہ نیچی سطح کی شہرت — یہ دلوں پر اس کی صورت
ہوس میں جس کی نادیدہ — ہر کس و ناکس ہے گرویدہ
یہ وہ مقصد دل وجاں کے — وہ نصب العین انساں کے

گمان و وہم سے باہر　　نہیں ہو سکتے جو ظاہر
حساب ان آرزوؤں کا　　شمار ان جستجوؤں کا
لگانا ہے تجھے غافل　　کہ ہو اندازہ کامل
خیالات فراواں وہ　　تصور ہائے پنہاں وہ
دلوں کے بے صدا نغمے　　وہ لب نا آشنا نغمے
تھے جُرعے نہ ہیں جو خم کی　　ہے لازم ان کی گنتی بھی
مغاں ہے باخبر جن سے　　ہے آگہ کوزہ گر جن سے
مقام غور ہے ناداں　　ہے ساغر کس لئے گرداں
یہ ربط آب و گل کیوں ہے　　یہ رشتہ مستقل کیوں ہے
ہے نا سمجھوں کا فرمانا　　"وہ کہ برق آسا گذر جانا"
"نہ رکھ کل تک خم و مئے کو　　لٹا دے آج ہر شے کو"
نہیں گو وہ حسیں منظر　　نہیں وہ نقشۂ ساغر
مناظر وہ محبت کے　　نگار ناز و الفت کے
بھیانک شکلیں ہیں اکثر　　خطوط جام ہستی پر
جھجک مت پی لے جرأت سے　　شراب تلخ رغبت سے
نظر کر جانب رفعت　　اگر ہے طالب رفعت
ضیافت کا وہ ہنگامہ　　وہ شمع بزم کا شعلہ
وہ موج بادہ کی لرزش　　لب ساقی کی وہ جنبش

ہے جام آسمانی تو
وجود غیر فانی تو

سید عبدالرؤف شاہ عاصی

حُبِّ وطن

کیا ہے کوئی شخص اتنا مردہ دل زندہ کہیں
دہر میں جس کی زباں سے یہ کبھی نکلا نہیں

یہ ہے میری جنم بھومی، یہ مرا پیارا وطن
سوزِ الفت قلب میں جس کے نہ ہوا پیدا کبھی

ختم کر کر وہ سیاحت اپنی ملک غیر کی
لوٹے جب گھر کی طرف سہہ کر بہت رنج و محن

گر کوئی ایسا ہو، جاؤ غور سے دیکھو اسے
اس کا دل پاؤ گے خالی مطربوں کے جوش سے

گو اسے حاصل گرامی نام ہے، اعزاز ہے
گنج بے پایاں گو اس کا منتہائے آز ہے

باوجود ثروت و جاہ وخطابات کثیر
چوں کہ وہ کمبخت ہے خودکام اور تیرا ضمیر
نیک نامی سے رہے گا عمر بھر محروم وہ
اور مرے گا بایقیں درحالت مذموم وہ
قبر پر بن جائے گا جس میں وہ پھرناپاک دھول
کوئی روئے گا نہ گائے گا نہ ڈالے گا دو پھول

رسالہ "زمانہ" کانپور مئی ۱۹۲۶ء

ہمترجمے حصہ سوم صفحات ۷۹ و ۸۰ پر دیکھئے۔

ضامن کنتوری

دھوپ اور چاندنی

تخت افق پہ مہر تھا کل جب کہ جلوہ گر
اس کی جلو میں چاند بھی آیا مجھے نظر

تھا خون خشک اڑتی تھیں منہ پر ہوائیاں
جیسے پتنگ ہو کسی لڑکے کا اوج پر

اس تیز روشنی میں پڑھی میں نے ایک نظم
مضمون بھرے تھے جس میں تصوف کے سربسر

سمجھا میں ان نکات کو اوہام باطلہ
ایسا مرا دماغ تھا گرمی سے منتشر

زائل پہ رفتہ رفتہ حرارت وہ ہو گئی
دن یوں ڈھلا جوانی کی تھی گویا دوپہر

شب نے اڑھایا آن کے دامانِ عافیت
دریا و دشت و کوہ بیابان شہر پر

اس وقت ماہتاب بصد جاہ و تمکنت
نکلا چمک کے صورت معشوق فتنہ گر

وادی شب میں آ گیا سیلاب نور کا
طوفان میں چاندنی کے لگے بہنے بام و در

اب میں نے [illegible] لکھی جو پھر وہ نظم
کیوں کر کہوں کہ دل پہ ہوا اس سے کیا اثر

سب بے حجاب ہو گئے پردے میں ایک
دن کو جو شاہدانِ معانی تھے مستتر!

ارمغان فرنگ ۱۹۰۱ء

ہم ترجمہ حصہ سوم صفحہ ۳۳۱ پر دیکھیے۔

فضل الرحمن

کوئل

سن کے کوکو تری دلشاد ہوں میں
غم ایام سے آزاد ہوں میں

طائر زمزمہ پرواز ہے تو
یا کہ آوارہ ہی آواز ہے تو

سبزہ زاروں میں تجھے سنتا ہوں
پھول نغموں کے ترے چنتا ہوں

دشت و در کوہ و بیاباں کی نقیب
گرچہ ہے دور کی کرتی ہے قریب

دھوپ اور پھولوں کے گاتی ہے تو راگ
وادی اور بن میں لگاتی ہے تو آگ

سن کے نغمے ترے اے شعلہ نوا
کیا کہوں دل جو تڑپتا ہے مرا

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

دشت و گلزار کی دلبر ہے تو
تو بہاروں کی پیمبر ہے تو

رمز ہستی تری آواز حسیں
بزم فطرت کا ہے اک راز حسیں

یہ وہی دھن ہے جسے بچپن میں
میں سنا کرتا تھا ہر گلشن میں

یہ وہی گیت ہے میں جس کے لئے
ہمہ تن گوش رہا ہوں کب سے

کبھی گلبن میں کبھی صحرا میں
میں نے ڈھونڈا ہے تجھے دنیا میں

ایک امید تھی تو ایک سراب
عالم طفلی کا اک شیریں خواب

اب بھی سنتا ہوں جو نغمے تیرے
موہنے گیت، یہ میٹھے میٹھے

آتی ہے بھولی کہانی کی یاد
اپنے بچپن کی جوانی کی یاد

اچھے طائر اے حسیں جادو گر
اب بھی آتی ہے مجھے یونہی نظر

یہ زمیں اپنی پرستاں کی طرح
اک طلسمی چمنستاں کی طرح

حسرت موہانی

ترانۂ محبت

وادی و کوہ میں وہ برف پہ چمکا جس دم
ماہ روشن کو نکلتے ہوئے دیکھا میں نے
اور کس قصد سے اس وقت اٹھاتے ننھے قدم
اپنے آہو سے بھی یہ راز چھپایا میں نے

آگیا پاس مرے دوڑ کے کیوں کر آخر
ہو گیا قصد مرا کیسے ہرن پر روشن
میری وارفتگیٔ شوق سے واقف تھا مگر
آگیا کوچۂ جاناں میں جبھی تو یہ ہرن

مہرِ تابندہ سے جب گرم زمیں ہوتی ہے
بے دلی جوشِ مسرت سے بدل جاتی ہو
یاد تکلیف جفا کاریٔ سرما دل سے
آہ موسم گرما سے نکل جاتی ہو

مہر اُلفت سے تری جب سے ہوا دل روشن
نہ رہا نام و نشان رنج و الم کا باقی
مہر سے بڑھ کے ہے خورشید محبت کا چلن
اب نکل کر سوئے مغرب یہ نہ جائیگا کبھی

اختر جوناگڈھی

گلِ سرخ

نو شگفتہ یہ گلاب سرخ دیتا ہوں تجھے
آب شبنم سے جو دھل کر صاف اور شفاف ہے

تھا پرندِ شب کا یہ اتنا عزیز و دل رُبا
بیٹھتا تھا چاندنی میں اس کے سر پہ پھیلا
چھیڑتا تھا بیٹھ کر دل کش ترانے شاخ پر
رات بھر اس جا سنائے رہتا تھا وہ اپنا نغمہ
اک نفس اس پھول کو دے تو بھی اپنی زندگی
پیار کر اس کو بٹھا سینے پہ اپنے دو گھڑی
کیوں کہ دیکھے گا وہ جب یہ ناز برداری تری
یہ سمجھ لے گا کہ گویا وہ پرندہ تھا تو ہی

رسالہ النمر جنوری ۱۹۱۶ء

باسط لبوانی

سکاٹ لینڈ کی بدنصیب ملکہ میری

متّصل لکڑی کے کندے کے کھڑا جلاّد تھا
اس کی صورت کہہ رہی تھی وہ ستم ایجاد تھا
ہاتھ میں اس کے چمکتا تھا تبر اک بیگماں
جلدی جو ہونے ہی والا تھا غضب کا خونفشاں
آئی اک خاتون اتنے میں نکل کر ہال سے
پائے نازک اپنے وہ رکھتی تھی استقلال سے
دم بخود سب تھے لبوں پر لگ گئی مہر سکوت
ہر دل بیتاب خود تھا بیقراری کا ثبوت
شکل دیکھی غور سے تب میں نے پہچانا اسے
جانا تھا آج لیکن دیر میں جانا اُسے
آہ شہزادی وہی تھی رنگ لیکن اور تھا
حسن گل باقی نہ تھا پژمردگی کا دور تھا
میں نے دیکھا غم نے لاغر کر دیا تھا اس قدر
جسم نازک گور کے قابل ہوا تھا سر بسر

آنکھ پہچانی وہ میں نے گو بہت بے نور تھی
فتنہ پردازی میں یکتا جو کبھی مشہور تھی
ہائے اب کمزور تھی وہ جانفزا آواز بھی
جس کے آگے، ہیچ تھے سارے جہاں کے ساز بھی
بھوری بھوری ہو گئی تھی کاکُل خمدار بھی
جس کے آگے ماند تھے اک وقت زریں تار بھی
میں نے پہچانا وہ اعضا کا تناسب بیگماں
اف ری وہ رفتار محشر خوشخرامی الاماں
پھر گیا نظروں میں وہ گذرا زمانہ ہائے ہائے
خانقاہ پاک میں وہ اس کا جانا ہائے ہائے
شام کو وہ حمد گانے کے ترنم کا سماں
اور لب لعلین پہ اس کے وہ تبسّم کا سماں
صبح شادی کو وہ اس کا یک بیک آنا نظر
آسماں پر شام کو گویا ستارہ جلوہ گر
یہ تغیّر ائے فلک یہ کون سی بیداد ہے
اس کی شہرت اور رعنائی ابھی تک یاد ہے
اس کے قدموں کے تلے تھے تخت شاہی تین تین
انقلاب دہر نے اس سے لئے اک دم میں چھین

متصل لکڑی کے کندے پر کھڑی ہے مہ جبیں
موت کے تختے پہ ہو افسوس ایسی نازنیں

آخری ان دوستوں میں جو صدا دیتے تھے ساتھ
چھوٹا کتا رہ گیا جو چاٹتا ہے اس کا ہاتھ

اب کہاں احباب جن پر اس کی تھی چشم کرم
اب کہاں خدام وہ جو سجدہ کرتے تھے بہم

وہ ہوئی گردن برہنہ دست قاتل ہل گیا
وہ تبر بڑھ کر گلے سے نازنین کے مل گیا

دم وہ نکلا وہ اجل کی ہو گئی پوری ہوس
مرغ جاں وہ اڑ گیا وہ رہ گیا خالی نفس

اب کہاں وہ شکل زیبا! اب کہاں وہ روئے پاک
خون سے رنگیں پڑی ہے اب کسی کی مشت خاک

یہ رہا ہے گرم خوں اب قطرہ قطرہ فرش پر
دیکھنے والے نہیں ہوتے ہیں جس سے باخبر

چھوٹے کتے باوفا کتے کو اتنا یاد ہے
چاٹتا ہے خون آتا مائل فریاد ہے

اُف ری ایسی حور طلعت ماہ پیکر نازنیں
اُف رے ایسی با اثر ایسی تونگر نازنیں

نسل اسٹوارٹ کی وہ ایسی عالی خانداں
خوبی رعنائی میں بے مثل یکتا ہے جہاں
رنگ لائے اس طرح سے اس کا بخت واژگوں
آشنا ہو یوں زبانِ سگ سے اس کے دل کا خوں
کُتّا چاٹے اس کے خوں کو ہائے کیسا قہر ہے
کس قدر بے درد اے دل انقلاب دہر ہے
مرد غافل جا یہاں سے اور تو خلوت میں سوچ
بیٹھ جا چپکے کہیں پر خوب ہی فرصت میں سوچ
کیا عجب ہے پھر تری نظروں کا ایسا رنگ ہو
تختِ شاہی ذرۂ ناچیز کے ہم سنگ ہو

اودھ نرائن بسماریہ

وظیفۂ عشق

سیکھنا ایک جذبۂ فانی سے راہِ ارتقا
عشق کی اغراض میں مضمر تھا یہ سرِ بقا
عشق کی تخلیق، اس کی پرورش نشو و نما
بہرِ تردیدِ انانیّت تھی منظورِ خُدا
بندگیٔ نفس گویا خواب کی زنجیر تھی
فوتِ مقصودِ محبت اس کی اک تعبیر تھی

تارِ اشکِ چشمِ نم لیکن ہے باجِ دردِ دل
خارِ خشکِ حسرت وارماں خراجِ دردِ دل
شیوۂ انساں ہے رنج و گریہ و آہ و بقا
کلبۂ احزاں ہے قلبِ عاشقِ درد آشنا

راز چاندپوری

گلاب

اے گل خوش رنگ وخوشبو میہمانِ فصل گل
زینتِ صحنِ چمن، سرتاجِ گلہائے بہار

دایۂ فطرت نے بخشی ہے تجھے نشو و نما
دامنِ فطرت ہے میری زیست کا سرمایہ دار

یعنی ہم کو ایک ہی دن سے ہے یہ وابستگی
ایک ہی چشمہ سے ہم دونوں ہیں یکساں فیضیاب

ایک دن ہونا ہے ان دونوں کو بربادِ فنا
تیری رنگیں ماجرائی ہو، کہ ہو میرا شباب

ہاں مگر اس ربط میں بھی اک نمایاں فرق ہے
کیوں نہ میں حیرت زدہ ہوں دیکھ کر رنگِ جہاں

میں جواں ہوتا نہیں کھو کر جوانی ایک بار
فصل گل آتے ہی ہو جاتا ہے لیکن تو جواں

قلق میرٹھی

خواہش طفل

آرزو ہے بنوں میں ایک پرند
سب سے انچا اڑوں بہت ہی بلند
چرخ نیلی و ابر زریں کے
سیر کرتا پھروں کناروں پے
افق بحر سے بوقت سحر
پہلے سورج پہ پڑتی میری نظر
اور شعاع اس کی رنگتی پر میرے
پہلے مینار ہائے بالا سے
دیکھتا کوہ پر سے جرم اس کا
غرب میں جب نہ شفق ہوتا
پہلے اس سے کہ خواب میں جاتا
میں مناجات شام کو گاتا
جب کہ میں کوہ و دشت میں آتا
کس قدر ملک دیکھتا جاتا

سیر صحرا و کوہ میں اکثر
کیسی کیسی زمینیں آتی نظر

چرخ بے راہ کا نہ کرتا ہراس
وہم گمراہی کے نہ پھرتا پاس

میں وہاں اڑتا ہے جہاں یوفور
گرد زیتوں کے شعبۂ انگور

سایہ برگ حنا کا میں پاتا
دھوپ سے دوپہر کی بچ جاتا

اب چڑھوں گو میں کوہ اعلیٰ پر
تو بھی کچھ دور تک نہ آئے نظر

آہ ہوتے وہ بازو میرے پاس
کس قدر خوش میں رہتا بے وسواس

اڑ سکے باز یوں فلک پہ کہاں
جس طرح ہے خیال گرم عناں

ابر میں ہو پردہ دار لاکھ اگر
نظر چشم دل تو کے کیوں کر

تم ہو ہاں بھولتے دعائے شام
پیش خورشید پڑھنے سے کیا کام

حمد کرتے ہو تم تو اس کے حضور
رو برو جس کے مہر ہے بے نور

دورۂ شمس گرد چرخ و زمیں
جان سکتے ہو سیکھ کر بے یقیں
گرچہ حائل ہیں یہ سمندر سب
دیکھ سکتے ہو مشرق و مغرب

غیر ملکوں میں مرغ طیر کناں
رہنما ہوتا ہے ہوا میں ہاں
گو کہ بازو قرار اس کا نہ پائے
پہلے واں پر خیال تم کو لائے

مرغ کیسا ہی ہو قوی بازو
تھک سکے ہے یہ جانتا ہے تو
طاق وارستگی میں ہے ہرچند
یک کر سکتے ہیں اُسے پر بند

پر نہیں رہتا باز طیر خیال
ہے شعاعوں سے تیز سیر خیال
اک زیادہ ہے ملک خوب و خوش
اس سے جو ہے طیور کا دل کش

ہے جُدا یاں کے لالہ زاراں سے
اوّل و آخر بہاراں سے
پر نہیں یاں پرے ہے دُنیا کے
ہووے حکم الٰہی جن کے لئے

منوّر لکھنوی

صدمۂ جاں گداز

کشورِ انگلینڈ کا تھا جس پہ شہزادہ سوار
وہ جہازِ شاندار اُف! غرقِ قلزم ہو گیا
بحر میں موجیں ہیں تیزی سے لہراتی ہوئی
یک بیک برپا یہ کیا محشر کا عالم ہو گیا
کیا ہے اس زینت دہ اکلیلِ انگلستان کا حال
دل پسر کے غم میں جس کا وقفِ ماتم ہو گیا
آہ وہ زندہ رہا ٹوٹی نہ زنجیرِ حیات
آہ! وہ پنجیرِ حسرت کشتۂ غم ہو گیا
موت انھیں آتی نہیں کیوں ہو رہتے ہیں جو سوگوار
عرصۂ ہستی جنھیں ماہِ محرم ہو گیا
اُف! تبسم اس کے ہونٹوں پر پھر آیا ہی نہیں
زندگی بھر پھر کبھی وہ مسکرایا ہی نہیں

ایستادہ ہیں مصاحب شان گرد سریر
جس کو دیکھو نشۂ سوئے طرب سے چور ہے

لیکن اس کا جانشین ہو کون اب دربار میں
زیر امواجِ سمندر آہ! جو مستور ہے

پیش شہ گذرا کیا ایک سے ایک بڑھ کر حسیں
بزم میں صہبائے عشرت سے ہر ایک مسرور ہے

بزم میں ہر مہ جبیں مدہوش کیف مل ہے آج
نشۂ مے سے یہاں دیدہ ہر اک مخمور ہے

موجیں لیتی ہیں تھپیڑے شہ کے بیٹے پر مگر
موئے سر ہر ایک جس کا روشن و پرنور ہے

اُف! تبسم اس کے ہونٹوں پر پھر آیا ہی نہیں
زندگی بھر پھر کبھی وہ مُسکرایا ہی نہیں

وہ وہاں بیٹھا ہے چلتے ہیں جہاں ساغر کے دور
دربیاں میں رکھنا مہمانوں کے دسترخواں ہے

مطربوں کے راگ دلکش ہو رہے ہیں گوش زد
دعوتِ شیراز کا اس بزم میں سامان ہے

دل لگی میں جس کے سرسہرا رہا ہے جیت کا
دیکھنا ہے اس کو لیکن اور جانب دھیان ہے

وہ شجاعت آزماؤں کی بھری محفل میں ہے
زینت جلسہ انوکھی ہے نرالی شان ہے

ہے ہم آہنگ نوائے ساز بحر موج زن
ہم نوائے سازِ محفل شاہ کو طوفان ہے

اُف تبسم اس کے ہونٹوں پر کبھی آیا ہی نہیں
زندگی بھر پھر کبھی وہ مسکرایا ہی نہیں

ضامن کنتوری

عشق وحسرت

خدا جانے وہ بیداری تھی یا تھا خواب کا عالم
نظر آئی مجھے اک ٹیلہ پر بیٹھی ہوئی حسرت

کبھی غم سے مخاطب ہو کے کہتی او مرے ہمدم
کبھی جانسوز آہیں بھرتی تھی جو اس کی ہے عادت

کبھی کر کر کے نالے کہتی تھی درد جگر اپنا
پٹکتی تھی کبھی سنگِ مصیبت پر وہ سر اپنا

فلک پر سے یہ بولا ناگہاں اک ابر کا ٹکڑا
یہ نرمی جیسے ہو نغمہ خوش آیند آبشاروں کا

ہوائیں چل بسیں سب چھوڑ کے مجھ کو یہاں تنہا
میسر ہوگا کب دیدار یا رب کوہساروں کا

نہ جب تک شبنم افشانی کی حاجت ہو زمستاں میں
مجھے رہنا ہے اس آتش زدہ صحرائے ویراں میں

تپش نے مہرِ عالم تاب کی ایسا اثر ڈالا
کہ جس سے تپ مجھے آنے لگی اور ہوگئی کافور

ہے اس حالت پہ بھی کام اس نے اپنا میرے سر ڈالا
بنا رکھا ہے مجھ کو بادبان کشتیِ اخضر

مری حسرت! جو تو اک آہِ طوفان خیز دے مجھ کو
تو اتروں اس ہوا میں نیچے اور دوں میں دُعا تجھ کو

مگر تھا عشق حاضر اس گھڑی اس کی حضوری میں
بصد عجز و تملق وہ گرا قدموں پہ حسرت کے

اسے رہتی تھی جد و کد بڑی اس کی حضوری میں
جواب اس نے دیا یہ ابر کو حسرت کی جانب سے

نہیں! ہرگز نہیں!! ممکن نہیں!!! یہ ہو نہیں سکتا
جو دولت خاص میری ہے وہ تو لے ہو نہیں سکتا

سمجھ لے اس جگہ پر عشق کا قبضہ مسلّم ہے
قدم رکھتی ہے حسرت جس جگہ دُنیا کے پردے پر

غذائے روح میرے واسطے اس کا ہی غم ہے
مزے لیتا ہے دل اس کے ہر اک پر درد نالے پر

اسی پر ناز ہے مجھ کو اسی سے نام ہے میرا
یہ میری ہمنفس ہے اس کی خدمت کام ہے میرا

ارمغان فرنگ ۱۹۰۱ء

صادق علیخان

خوابِ ناز

اے شبِ ماہتاب کے تارو   فلکِ نیلگوں کے سیّارو
فرد نیلوفری میں منہ کو چھپاؤ   غرقِ دریائے نیل ہو جاؤ
خوب ہے خوب ہے تمہارا لباس   پھر بھڑک اس کی رکھو اپنے پاس
پیلی آنکھیں نہ بس دکھاؤ بہت   شمعِ سحری! نہ ٹمٹماؤ بہت
میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

تجھ سے کہتا ہوں ماہتابِ بہار   کس لئے کھو رہا ہے اپنا وقار
کیوں نہ ہو غرقِ بحرِ تاریکی   چاندنی پڑ گئی بڑی پھیکی
آن بان اور چمک دمک نہ دکھا   اب بھی آمان لے ہمارا کہا
کوئی دم میں ترا سُنہری نُور   ہوا جاتا ہے دیکھ کے کافور
رنگ فق حال ہے خراب تیرا   ہے لبِ بام آفتاب تیرا
کوہِ مغرب سے تاکنا کیا ہے   پسِ دیوار جھانکنا کیا ہے
میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

اے صبائے بہار کے جھونکو — اے شبِ مشکبار کے جھونکو
اس قدر شوخیاں نہیں اچھی — ایسی بے تابیاں نہیں اچھی
بیٹھو اس کنجِ عشق پیچاں میں — سنبل و بید مشک و ریحاں میں
اپنے پر لو سمیٹ مارو نہ دم — ہلا پتہ تو سر کروں گا قلم
ہوا بیکا گر اس کے زلف کا بال — سارا بل میں تمہارا دوں گا نکال

میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

خواہا ئے شبِ بہار! سنو — عرض کرتا ہے دل نگار اسنو
للّٰلہ اتنا کرو ہمارا کام — کان میں اس کے دو یہ جا کے پیام
غیرتِ حسن ماہ و مایۂ ناز — تیری ہر بات میں نیا انداز
تو کرے خوابِ ناز میں آرام — منتظر تیرا صادقِ ناکام
شب گذارے ہے آہ و زاری میں — تیرے بالیں کی پہرہ داری میں
جاں بلب ہے تمہارا خستہ جگر — ہے زباں پر مگر یہ مصرع تر

میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

رسالہ مخزن مارچ ۱۹۰۳ء

محمد اکبر وفاقانی

دو آنسو

"دُنیا" "زندگی" زمانہ　　کس کس کے قدم پہ میں چلوں گا
جب رہ میں ڈگیگا پاؤں میرا　　کس طرح قضا کا ساتھ دوں گا
اے نُورِ ازل تیرا تبسّم　　کب ظلمتِ غم میں عام ہو گا
کسطرح سے روؤں اپنے دل کو　　کب قصّہ مرا تمام ہو گا

اے رونقِ روزگار بتلا　　کالی اُجلی چمک سے تیرے
کیوں اُڑ گیا طائرِ مسرت　　ٹیڑھی ترچھی چھپک سے تیرے

آتی ہے بہار کی پری جب　　ہوتی ہے خزاں کو بیقراری
جاتی ہے بہار کی پری جب　　ہوتی ہے غضب کی برفباری

دل میرا غریب ٹمٹما کر　　ہے شمع سحر جو بجھ رہا ہے
اور حسنِ خیال مثلِ شانہ　　زلفوں میں ترے اُلجھ رہا ہے

برق دہلوی

پیمانِ وفا

رکھ یقین گر ترے دل آواز اندازِ شباب
محو نظارہ ہوں جن کا اب باصد جوشِ شوق
کل بدل جائیں کہ سب مٹ جائیں جوں نقشِ طلسم
اور تیرے قبضۂ قدرت سے ہوں روپوشِ شوق
پھر بھی میں تیرا پرستندہ ہوں گا جانِ من!
جس طرح ہوں اس گھڑی کھوئے ہوئے آغوشِ شوق

مٹ بھی جائے دلفریبی حسن کی تیرے اگر
اور یہ ہونا ہے، کہ ہے وقفِ خزاں فصلِ بہار.
پھر بھی اس ویرانۂ دلکش میں اک اک آرزو
شوق سے ہوتی رہے گی گرد پھر پھر کر نثار

یہ نہیں جب تک ترے قبضے میں ہے حسن و شباب
اور عارض پر ترے بہتے نہیں اشک رواں
تب ہی تک محدود ہے اظہار جذب شوق دل
اور ہو سکتی ہے ظاہر حسرتِ عشق نہاں
بلکہ جوں جوں اس طرح عرصہ گذرتا جائے گا
روز افزوں تجھ سے اُلفت ہوگی اے جانِ جہاں

کیونکہ وہ دل اُلفتِ صادق ہو جس میں جاگزیں
تا دمِ آخر نہیں دیتا محبت کو جواب
جس طرح سورج مکھی کا پھُول از وقتِ سحر
قبلہ رو رہتا ہے تا وقتِ غروبِ آفتاب

(رسالہ زبان ۱۹۰۸ء مئی)

فضل الٰہی قریشی

اطمینان قلب

ڈالتے ہیں ہم نگاہِ حسرت آگین گردوپیش
اور طلب کرتے ہیں وہ شے جو ہمیں حاصل نہیں

یہ ہماری بزلہ سنجی یہ ہمارے قہقہے
باطناً اندوہ حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں

ہیں ہماری جس قدر دلچسپ نظمیں اور گیت
وہ سراپا درد ہیں، دلسوز اور اندوہ گیں!

رنج و حرماں سے جہاں میں کوئی گھر خالی نہیں
ہم کو دنیا میں میسر فارغ البالی نہیں

محمد معین الدین لکھنوی

دن ڈھلا

ڈھلا دن لیلیٰ شب نے سرِ رُخ بال بکھرائے
سیاہی چھا گئی عالم پہ، بڑھ کر اس کے گیسو سے

ہے سقفِ چرخ سے بارانِ ظلمت اس طرح جیسے
گریں پر ٹوٹ کر اڑاتے ہوئے طائر کے بازو سے

چراغ ان سامنے کی بستیوں کے دیکھتا ہوں جب
شعاعیں چھن رہی ہیں جن کی اس کُہرے کی چادر سے

تو دل پر چھانے لگتا ہے غبارِ اندوہ کی صورت
تحمل ہو نہیں سکتا ہے جس کا قلب مضطر سے

غبار اس یاس و کُلفت کا نہیں ہم رتبہ کلفت
مگر پھر بھی مشابہ ہے بہت کچھ رنج و حرماں سے

غبارِ یاس کو ہے رنج اور حرماں سے وہ رشتہ
جو رشتہ قطرہ ہائے آبِ شبنم کو ہے باراں سے

سنا سادہ سی اک نظم، اے مرے ہمدم، ترے صدقے
کہ اشعار اُس میں چبھنے والے ہوں ہر دل میں نشتر سے
کریں جو رفع میرے دردِ دل کے دردِ پیہم کو
نکالیں سارے دن کی فکر و وحشت جو مرے سر سے

نہیں میں چاہتا اشعار استادانِ سابق کے
نہ سننا چاہتا ہوں ماہرانِ فن کے دیواں سے
کہ آوازِ قدم ان رہرووں کی گونج اٹھی ہے
اُلٹ دی ہے زمیں ٹکرا کے جس نے چرخِ گرداں سے

قوی تخییل ان کی مثلِ طبلِ جنگ کہتی ہے
ہزاروں زندگی میں معرکے سر ہوں گے کوشش سے
مگر میں چاہتا ہوں آج میٹھی نیند سو جاؤں
دلہٰذا سارے جھگڑے ہیں یہ خارج مری خواہش سے،

کلام، القصہ پڑھ دے بس کسی کم رتبہ شاعر کا
جو نکلا ہو کلیجہ چیر کر یوں قلبِ مضطر سے
برسنے لگتا ہے جس طرح پانی ابرِ نیساں کا
رواں ہوتے ہیں یا جس طرح آنسو دیدۂ تر سے

اسی شاعر کو چُن جو اپنے ایام مشقت میں
اور اُن راتوں کو بھی جن میں نہیں سویا وہ راحت سے
سُنا کرتا تھا اپنے سازِ دل کے بے صدا نغمے
ترنّم میں تھی حیرت آفرینی جن کے شدت سے

بس ایسے شاعروں کا راگ اک تسکین دیتا ہے
ہر اس دل کو تڑپتا ہو جو رنج و بے قراری سے
تسلّی جس طرح سے بعد توبہ دل کو ہوتی ہے
دگنہ کے عفو کی اُمید اگر ہو فضل باری سے،

اک اچھی انتخابِ نظم کر لے اور پڑھ اس کو
سنا دے آج کچھ اپنی بیاض پُر جواہر سے
بڑھا دے اور بھی، ہاں، لذت ہر شعر ترہم دم
ترنّم اپنے الحال کا ملا کر ساز شاعر سے

مری رات آج اس نغمہ کی خوبیت میں کٹ جائے
پریشانی و فکر اس طرح رُخصت ہو مرے دل سے
کہ جیسے صبح اُٹھ کر خامشی سے قافلے والے
اٹھا لیتے ہیں بستر اور چل بستے ہیں منزل سے

تلوک چند محروم

ذکر ابابیل بدیسی کا

اے ابابیل تیز بازو و پر
چرخ بازی میں تیز بازی گر
تیتریوں کا جب کرے ہے شکار
تیز پروازیوں میں سو سو بار
کبھی نیچے ہے اور کبھی اوپر
اور کبھی ہے ادھر کبھی ہے ادھر
گر ہیں ہم سیر تیرا ہو سکتا
بر سر دشت اور سر دریا
موج زن ہوتی کیسی کیسی نہر
اور ہوتے نمود کیا کیا شہر
میری آنکھوں کے سامنے کیا کیا
آتے آفاق ہائے ارض وسما

اوّل انگلینڈ کے جنوب آتا
آبنا پر سے پھر بلند اڑتا
پر خطر راہ آگے پیش آتی
تا بدشت فرانس بڑھ جاتی
خیل مرغاں میں کھیلتا یکسر
ساحل اخضر لوآئر پر
اور نہر گرون کے ساحل پر
بورڈیو ہے جہاں پہ زیب آور
ہو کے ہم سطح بسر اڑتا
تیز بالی سے جوں نظر اڑتا
اور کوہ پرینی پر آکر
اس کے ہیں شجر جہاں بکھر
شاخ شاخِ درخت پر اڑتا
ہو کے پھر واں سے تیز تر اڑتا
دشت اسپین میں کہ ہیں پھرتے
گرگ صیاد گرد گلوں کے
کیڑے ریشم کے پورتے ہیں وہاں
اور زیتون کا ہے نخلستاں

کیسے آہستہ اور بہ استقلال
چلتے ہیں دل کشی سے خچر چال
ایسی ہے روز و شب میں ماہ و شہور
جاتا سوئے دکن نہایت دور
کوہ طارق کے بھی کرارے سے
اور سمندر کے بھی کنارے سے
اڑ کے افریقہ کے کناروں پر
جو ہیں خوش میوہ دار گرم و تر
کرتا آرام تا زمانِ بہار
کہ نسیم بہار ہو کے دو چار
راستہ پر وطن کے لے آتی
میرے مولد میں مجھ کو پہنچاتی

نادر کاکوروی

حسن کامل

صوفیہ کے حسن سیرت پر لکھے کچھ میں نے بند
یعنی ایسی نیک، ایسی دلکش، ایسی دل رُبا
لوگ ان کو پڑھ کے بولے شعر تو ہیں دلپسند
لیکن ان میں حسن صورت کا مرقع ہے کھنچا
میں نے نقشہ کھینچا پھر رنگینئ الفاظ سے
اس کی پیاری شکل کا، اس میں بھی نکلی ایک خبیہ
یوں کہ میں نے حسن کامل تھا کیا ثابت سے
خلق کہتی ہے کہ یہ ہے اک سیرت کی شبیہ
آہ اس معشوق کو کیوں کر نہ چاہے دل مرا
جو حسین ہو، نازنین ہو، باوفا ہو، نیک ہو
اس بت کافر کی حق یہ ہے پرستش ہے روا
حسن سیرت، حسن صورت، جس میں ہر ایک ہو

نور لکھنوی

آزادی

بنا پتھر کی دیواروں سے کب زنداں زمانے میں
قفس بنتا نہیں زنہار لوہے کی سلاخوں سے
ہوئے تر دامنی سے پاک جو انساں زمانے میں
نکالا کام حجرہ کا انھوں نے ایسی چیزوں سے

جو شامل رنگ کاری ہے مری رسم محبت میں
خوشی سے ہم اگر آزادِ حرص و آز رہتے ہیں
فرشتوں کو وہ آزادی فقط حاصل ہے اُلفت میں
کہ چرخِ اخضری پر مائلِ پرواز رہتے ہیں

ضامن کنتوری

دوستی

گوہرِ شب تاب عالم میں ہے گر ایسا کوئی
کھو سکے تاریکیٔ قلبِ حزیں جس کی ضیا
ایسی شے لاریب دُنیا میں فقط ہے دوستی
یہ وہ گوہر ہے کہ نورِ مہر ہے اس کی ضیا

گو ہمیشہ سے محبت کا زمانہ میں ہے کال
جب تلاش اس کی کرو گے بر محل مل جائے گی
کوئی شے ایسی نہیں ہو جس کا ہاتھ آنا محال
آج گر ملتی نہیں ڈھونڈے سے کل مل جائے گی

ہمدردِ اُلفت کا مگر جب کوئی تم سے دم بھرے
سب فرائض دوستی کے جانچ لینا چاہئے
یارِ شاطر ہونے کا ہر چند وہ دعوے کرے
ہر کس و ناکس کو لیکن دل نہ دینا چاہئے

صاف طینت پاک باطن نیک دل اور حق شناس
رازِ دل کہنے میں کرتے ہیں بہت کم پیش وپس
عام لوگوں کو بھی کر لیتے ہیں اپنا سا قیاس
ہوتے ہیں از خود اسیر دام کید بوالہوس
دُور ہو جاتی ہے گو خود یہ غلط فہمی مگر
کس قدر نقصان خفّت اور پریشانی کے بعد
خوئے زشت بدظنی ہے جس کا بالآخر ثمر
سرگرانی جیسے کیف راحِ ریحانی کے بعد
لیں نہ اس بارے میں گر آنکھوں سے اپنی کام ہم
اور خذف ریزوں کو سمجھیں گوہر با آب وتاب
حظِّ اُلفت سے رہیں گے عمر بھر ناکام ہم
بزم خلّت کو بھی سمجھینگے کہ دل خوش کن ہے خواب
خود غرض کے دام میں پھنسانہ ضامن دیکھنا
دوست ایسوں کے کبھی بنتے نہیں روشن ضمیر
ان دلوں میں مل نہیں سکتا ہے اُلفت کا پتہ
خود فروشی اور دنائت سے ہوا جن کا خمیر

باسط بسوانی

نپولین کی موت

ہر جا شبِ طوفان میں حسرت کا نشان دیکھا
بالیں پہ سپاہی کے آفت کا سماں دیکھا
جذبات کا طوفاں تھا اس کے دل مضطر میں
ویسا نہ تلاطم تھا کوئی بھی سمندر میں

احباب تھے جو حاضر صرف ان سے محبت تھی
مشغول تھے ماتم میں، بالیں پہ قیامت تھی
اس کا دم آخر تھا، معلوم ہوا اُن کو
ہاں آنکھوں کی رنگت سے مفہوم ہوا اُن کو

چہرے سے مگر شاہی اک رعب نمایاں تھا
احکام کے دینے میں اُس دم وہ شتاباں تھا
ایام گزشتہ ہی اس خواب کا ساماں تھا
ہر قوم تھی جب لرزاں لشکر بھی پریشاں تھے

ہاں خواب میں خنجر کو پھر اس نے رواں دیکھا
پرچم وہ عقابی بھی نفرت کا نشاں دیکھا
اسٹریا کے لشکر کو پھر دیکھا پریشاں تھا
خرگوش کوئی گویا کتّے سے گریزاں تھا

پھر "روس" کے لشکر کو موقعہ نہ دیا اس نے
ہاں خیمہ "پرشیا" کا پھر لوٹ لیا اس نے
افواج دلیر اُس کی پھر نعرے لگاتی تھیں
اندلس کے پہاڑوں کو رہ رہ کے ہلاتی تھیں

ہاں الپ کی سردی میں اور مصر کے میداں میں
ریتی پہ کبھی پہنچا کہ کوہ فلک شاں میں
ڈینوب سے دریا کے ساحل پہ کبھی اترا
پھر اٹلی کے چشمے میں وہ جا کے کبھی ابھرا

سوئس کے مکانوں کے نزدیک کبھی پہنچا
برفیلی پہاڑی میں بہتے ہیں جہاں دریا
خوابِ دمِ آخر میں ہر گھڑی یوں ہی پھر گھالا
لشکر سے کیا اپنے عالم کو تہہ و بالا

مرِنگو کے میدان کو پھر جیت لیا اُس نے
جینا کی لڑائی میں پھر نام کیا اُس نے
اک دم میں کیا اس نے پھر زیر و زبر دنیا
توپوں کی گرج سے تھی پھر خاک بسر دنیا

جب دن وہ ہوا آخر تب جانِ حزیں نکلی
اس دن کے فسانوں سے پر یاد نہیں نکلی
سب چھوڑ چلے، تربت اک ہاتھ رہی اُس کے
شہرت تھی وہ جراءت کی جو ساتھ رہی اُس کے

میلارام وفاؔ

معصوم کی لاش

راس تدبیر آئی جب دھوکا مقدر دے گیا
صدمہ تیری موت کا مجھ کو اٹھانا ہی پڑا
کھینچ کر اک دن جو دل مدفن پہ تیرے لے گیا
اشک خونیں تیرے پھولوں پر بہانا ہی پڑا

کھیل سے تھک ٹوٹ کر لیٹا ہوا تھا تو مگر
کر سکا مجھ کو نہ اٹھ کر بستر گل سے سلام
آہ ! کیا جانیں ابھی تک کھیلتا تھا تو مگر
کھیلتا تھا موت سے اور کر رہا تھا ابتسام

میں نے سمجھا تجھ کو محوِ خواب شیریں بالیقیں
آہ! بے حس تھے پپوٹے تیرے سوتے آسماں
بال تو ساکن تھے، آنکھیں جھانکتی تھیں بالیقیں
اس لئے نکلی نہ میرے قلب محزوں سے فغاں

آہ! اس کو مرضیٔ خالق سمجھ کر میں ملول
مسکرایا اور پکارا نام تیرا بار بار
آہ! تیرے بستر گل پر چڑھا کر ایک پھول
چھوڑ آیا تجھ کو تیرے کھیل پر اور نزار

قلق میرٹھی

دربیان تمیز حق وباطل

چھوٹا لڑکا تھا مدرسے میں ایک
نسبت اور لڑکوں کے سلیم اور نیک
ایسا وقت آیا ایک اس کا ہوا
امتحان دیانت و تقویٰ
اس کے ہم جولیوں کی سازش تھی
کسی باغیچہ کے چرانے کی
التجا اس سے کی کہ ہو تو معین
بے معین کوئی کام خوب نہیں
متحیر ہوا وہ شرم پناہ
کیا انکار اس نے ان سے کہ آہ
کیا چرائیں گے چیز کم مایہ
ہے ہمارا غریب ہمسایہ

کرتا ہوں میں تمہاری بھی منت
یہ ارادہ برا ہے جاؤ مت

اور علاوہ وہ مرد مفلس ہے
باغ روٹی ہے اس کا اس کے لئے
پھر خیال اس کے بیچے بچوں کا
کیوں کہ ان کا بھی ہے وہی ٹکڑا

خوب کہتے ہو تم ہو نیک شعار
پر ہمیں سیب باغ ہیں درکار
سیب لاویں گے دیویں گے حصہ
تم چلو گے جو ساتھ البتہ

گر نہ جاؤ گے تم تو ہم لاریب
ناشپاتی نہ دیں گے تم کو نہ سیب
کہہ چکے وہ تو ٹام نے جانچا
دل میں اس گفتگو کو سرتاپا

دیکھتا ہوں کہ جائیں گے وہ ضرور
کتنا افسوس ہے کہ ہوں مجبور
تھا مناسب غریب ہمسایہ
اس کو نقصان نہ پہنچنے دیتا

حیلہ ممکن جو کوئی پاتا میں
میوہ ہمسائے کا بچاتا میں

پر مرا پیچھے ان سے رہ جانا
فائدہ مند اس کو کیا ہوگا

منحصر مجھ پہ رہتا گریہ کار
سیب اس کے درخت سے زنہار

گرنے دیتا نہ گرتے وہ جب تک
جوں کے توں ہی لٹکتے وہ بے شک

لیک وہ لیں گے واقعی اس کو
دل میں ہے جاؤں میں بھی ہو سو ہو

ہوگا جانے سے میرے کیا نقصاں
گر ملے مجھ کو چند سیب وہاں

ہوا جب اس طرح سے رفع گماں
ہوگیا بارے اس کو اطمینان

گو وہ تجویز میں شریک ہوا
پر ملامت کناں خلاف رہا

لوٹ کا حصّہ گو کہ اس نے لیا
لیک مالک پر اس کو حیف رہا

خواب غفلت میں آنقا آیا با
اس کے دل کا پہ جلد جاگ اٹھا

سخت الفاظی سے عتاب کیا
اہل تقصیر کو خطاب کیا

حیلہ چھوڑو بچو ہے بدنامی
سخت بے فائدہ ہے خودکامی

ہوں تمہارے اگرچہ کچھ اقوال
عدل ہوگا مطابق افعال

مرزا شیدا امرتسری

غریب کی موت

راہرو! محوِ شوخیہائے اندازِ خرام
طائرِ روحِ رواں کی عجلت پرواز دیکھ
مٹ رہا ہے صفحۂ ہستی سے کس بیکس کا نام
کون ہوتا ہے قماریاں میں سرباز دیکھ

گرچہ مہدِ ناز میں پروردۂ دولت ہے تو
اور فرشِ خاک پر ہے وہ جبیں سائے نیاز
ناشناسائے جمالِ شاہدِ عبرت ہے تو
اس کو حاصل ہو رہا ہے بارِ خلوت گاہِ راز

ہے نمایاں چشمِ حسرت سنج سے کیا بے بسی
کوئی پرساں بھی نظر آتا نہیں بیمار کا
کلبۂ احزاں پہ اس کے پاسباں ہے بے کسی
یا سر و ساماں بسرِ دمِ موت ہے نادار کا

ایک طفلِ شیرخوار اس گھر میں آتا ہے نظر
جس کی قسمت میں ہو بس گہوارہ سطحِ زمیں
اور سرِ بالینِ بیمار اک زنِ فریادگر
جس کے نازک ہاتھ میں زیرِ سرِ شخصِ حزیں

ہے نہ اس کی نبض نامحسوس پر دستِ طبیب
اس کی میت پہ ہجومِ دوستاراں بھی نہیں
گوش ہے ناآشنائے ماتمِ مرگِ غریب
آہ! اس بے کس کا کوئی مرثیہ خواں بھی نہیں

رہ گیا خالی قفس طائر نکل کر اڑ گیا
خاک کا اک ڈھیر افتادہ ہے فرشِ خاک پر
کون ہے جو روح کو جا کر کہے یہ ماجرا؟
اے کہ تو مسند نشیں ہے ساحتِ افلاک پر
یاد آراز محبتِ دیرینہ دمساز خویش
باز بنگر خود بخاک اندر شہید ناز خویش

اختر جوناگڈھی

غنچے

کھل کے گل کچھ تو بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کس لئے مُرجھا گئے اے غنچہ ہائے نوشگفت؟
ہے ابھی اُٹھتی جوانی ہو گئے کیوں ایسے سُست

ٹھہر جاؤ کچھ تو دکھلا دو بہار جاں فزا
پھول پھل لے آؤ پھر جانا تو اک دن ہے رکھا

آدھ گھنٹے کے لئے کس واسطے پیدا ہوئے؟
اپنی تھوڑی زندگی پر کس لئے شیدا ہوتے

تم کو قدرت نے ہے صرف اس واسطے پیدا کیا
تاکہ دکھلا جاؤ تم اپنی بہار جاں فزا

اس تمہاری چند ساعت زندگی کو دیکھ کے
ہوتی ہے عبرت کہ فانی ہے یہاں ہر ایک شے

سب تمہاری طرح ہم بھی یونہی کملا جائیں گے
جائیں گے اس جہاں سے پھر نہ واپس آئیں گے

رسالہ تمدن مارچ ۱۹۱۲ء

محمد سیف الدین شباب

مرغ بسمل

اب پر و پرواز کے قابل ترے بازو کہاں
خاک تیرائے تجھے موجِ نسیمِ گلستاں
تجھ پہ چھائے گی نہ شاخ گل پہ وہ خود رفتگی!
نو نہالان چمن کی لوریوں میں پھر کبھی!

اب بہارِ سبزہ و گل سے بھی تو محروم ہے
شوقِ دل کی کشمکش اور دیدِ گُل معدوم ہے
خس کی خوشبو سے بھی دل ہو گا نہ پھر فرحت فزا
سیوتی کے کنج میں ہو گا نہ تیرا گھونسلا

خوب طوفان میں نکالے تو نے دل کے حوصلے
اب کہاں سرگوشیاں وہ ابر دریا بار سے
اب فقط سبزہ پہ لے دے کر پھڑکنا رہ گیا
ان شکستہ بازوؤں کے تولنے سے فائدہ؟

گرچہ تو مایوس ہے اور ختم الفت ہو چکی
پر مری دل سوز ہے یہ دو گھڑی کی زندگی

کیوں کہ وہ ناوک فگن جس کا کہ تو نخچیر ہے
میرے بھی مجروح کرنے کو سی کا تیر ہے

میں بھی لذت آشنا ہوں عشق کے طوفان کا
شوق دل سے کر لیا ہے میں نے سر یہ معرکہ

چاندنی راتوں میں کیں میں نے فلک پروازیاں

خاک سے اڑنے کی بھی اب تو نہیں طاقت رہی
رینگتا چلتا ہوں خوں روتا ہوں ہمدم ہر گھڑی

وہ کمال کہ جس نے کر لیا تیرا شکار
کیا عجب ہو اس کو اوروں کی طرح مجھ پر بھی پیار

رسالہ تمدن اکتوبر ۱۹۱۱ء

عبدالمجید سالک

تنہائی

ہنسوں تو اہلِ عالم سب شریکِ خندہ ہوتے ہیں
جو روؤں تو کوئی ہمدم نہیں جز رنجِ تنہائی
خوشی میں غصہ لینے کے لئے تیار ہے دُنیا
مگر کوئی نہیں سرمایۂ غم کا تمنّائی

جو گاؤں تو جوابِ نغمہ کہساروں سے سنتا ہوں
بھروں آہیں تو رہ جاتی ہیں معدوم فضا ہو کر
صدائے بازگشت آتی ہے سن کر نغمۂ عشرت
مگر نالوں سے کترا جاتی ہے نا آشنا ہو کر

سُناتا ہوں خوشی تو مرجعِ اہلِ جہاں ہوں میں
مگر مغموم ہوتا ہوں تو سب آنکھیں چراتے ہیں
زبانِ عیش ہی میں دوست ہیں دُنیا کے باشندے
یہ میری داستانِ درد کب سننے کو آتے ہیں!

اگر خوش ہوں تو لاکھوں مرے احباب شیدائی
جو غم کھاؤں، غم بے مہریِ یاراں سے مرتا ہوں
مرے شغل سے کلگوں میں سب شرکت کے خواہاں ہیں
مگر تا لخابۂ حسرت کے میخانے میں تنہا ہوں

بچھاؤں خوانِ نعمت تو بہت ناخواندہ مہماں ہیں
نہیں فاقہ مستی میں شریکِ حالِ بد کوئی
سخاوت زندگی میں کامیابی کی معاون ہے
مگر ہنگامِ مردن کر نہیں سکتا مدد کوئی

بساطِ محفلِ عشق و مسرت میں وہ وسعت ہے
کہ طول و عرض میں اس کے سما سکتی ہے اک دنیا
مگر اس تنگنائے غم میں اے دنیا کے باشندو
گذرتا ہے ہجومِ بے کسی میں ہر بشر تنہا

بشیر احمد طاہر

جنگل کا بادشاہ

عجب تیرے لچھن ہیں اے شیر نر
غضب ناک تیور، غصیلی نظر

تری آنکھ میں آگ ہے آگ ہے
ترے دل میں رہتا کوئی ناگ ہے

ہر اک کو تری ڈس رہی ہے نگاہ
تری کوئی جادو بھری ہے نگاہ

ڈکاروں سے تو جب گرجنے لگا
تو جنگل کا جنگل لرزنے لگا

سنہری زمیں پر سیاہ دھاریاں
ہیں نقاشِ قدرت کی گلکاریاں

ترا حسن ظاہر ہے شانِ جمال
نمونہ ہے قدرت کا تیرا جلال

بنی کون سی برق سے تیری نخو
تپا کون سی آگ میں یہ لہو

دہن یہ ترا دست و بازو ترے
یہ پنجے ترے اور یہ ناخن ترے

یہ ہتھیار تیرے ہیں فولاد کے
بنائے گئے ہیں یہ کس ہاتھ سے

رگیں ہے کہ لوہے کی ہیں یہ سلاخیں
زمیں تیرے دل کی ہے کیا سنگلاخ

جو بن کر ترا دل تڑپنے لگا
تو قدرت کا دل بھی دھڑکنے لگا

بنایا ہے چیونٹی کو جو مضمحل
بنایا اسی نے ہے کیا تیر دل

الٰہی یہ قدرت کا کیا پھیر ہے
جہاں ہے چیونٹی اور جہاں شیر ہے

عجب تیرے لچھّن ہیں اے شیریز
غضب ناک تیور، غضیلی نظر

ضامن کنتوری

فاختہ

گو اٹھاتا ہی نہیں یہ اک قدم بے دلیل
ٹھوکریں کھاتا ہے یاں انسان لیکن جا بجا
برخلاف اس کے وہ حیواں جن کی فطرت ہے کفیل
لاکھ ہوں بے عقل پر چلتے ہیں کم راہ خطا!
اک سہانی شام کو میں تھا جو محوِ سیر باغ
ناگہاں اک فاختہ کی کان میں آئی صدا
یہ صدا دیتی تھی بے شک عشقِ صادق کا سُراغ
اپنے جوڑے سے وہ یوں کرتی تھی اظہار ولا
یہ ہمارا رشتۂ مہر و وفا ایسا نہیں
ٹوٹ جائے جو زمانہ کی کشاکش سے کبھی
بلکہ یادِ عیش ایام جوانی بالیقیں
عہد پرحسرت میں پیری کی کرے گی دلدہی

راستبازی کی اگر ہے پاکبازی میں چمک
یعنی تیرے دل میں ہے جب تلک کرے مجھ سے نباہ
نورِ اُلفت صاف آنکھوں سے دکھائے گا جھلک
خود وفاداری پہ تیری میرا دل ہوگا گواہ!
وہ بلائیں عام ہیں دُنیا میں جو سب کے لئے
میں سمجھتی ہوں نہ ہوگا مجھ پہ کچھ ان کا اثر
اور جو ہو بھی ٹال دوں گی اس کو میں ہنس بول کے
تو خدا رکھے، شریکِ حال ہے میرا اگر
جب چمکتی ہے کبھی بجلی میانِ شاخسار
شاہباز آکر یہاں بیٹھتا ہے منڈلاتا کوئی
ڈرتی ہوں تو ہی نہ ہو جائے فقط ان کا شکار
وسوسہ اس کے سوا دل میں نہیں آتا کوئی
پاس زوجیت کا اس دم مجھ کو آتا ہے خیال
کرتی ہوں تجھ سے لپٹ کر حق محبت کا ادا
اُنہلاتے یک دلی پر یہ ادا ہوتی ہے دال
یعنی ہم کو موت بھی اک کر نہیں سکتی جدا
پر خدا ناکردہ گر بے اعتنائی تو نے کی
وہم باطل ہے مرا ہر چند یہ رکھنا معاف
دوسرے کو دیکھ کر یا بے وفائی تو نے کی
یا کیا برتاؤ مجھ سے رسمِ الفت کے خلاف

پھر نہ ہو گی مجھ کو حاجت برق آتشباز کی
چشم شاہین کی خاطر جینے کیوں پاؤں گی میں
مجھ سے پھر جائیں گی جس دم یہ نگاہیں پیار کی
آپ ہی اس غم سے چھاتی پیٹ کر مر جاؤں گی

اس طرح وہ دل لبھانے والی چڑیا خوشنوا
نغمہ سنجی کر رہی تھی صورت ساز طرب
جو سنا اس سے قلمبند اس کو میں نے کر لیا
گر سبق حاصل کریں انسان اس سے کیا عجب

ارمغان فرنگ۔ ۱۹۰۱ء

محسن زیدی

مفلس حسینہ

باہوں سے سینے کو ڈھکے — گردن جھکائے شرم سے
اک خوب صورت سائلہ — کچھ مانگنے کے واسطے
دربار عالی شان میں — اک بادشاہ وقت کے
گویا برہنہ آئی تھی — لیکن کچھ اس انداز سے
لفظوں کی ہر صورت کشی
سے تھی کہیں بڑھ کر حسیں
اک خسروانہ شان سے — تھا تاج و خلعت زیب تن
اُٹھا مرصع تخت سے — وہ مالک قوم و وطن
کہ خیر مقدم کر سکے — اور کہہ سکے کوئی سخن
اس بارگاہِ حسن میں — جو تھی وہاں جلوہ فگن
سارے امیروں نے کہا — آپس میں ہو کر ہم سخن
"یہ پیکر ناز و ادا! — یہ عشوہ گر نازک بدن!"
ہے ماند اس کے سامنے — سورج کی تابندہ کرن
اور خوب صورت صبح بھی
اتنی حسیں ہوتی نہیں

وہ مفلس و نادار تھی — اور پیرہن بوسیدہ تھا
پر خوبصورت جسم کچھ — اس طرح تھا جلوہ نما
خود بادلوں سے جس طرح — ہو چاند کچھ کچھ جھانکتا
چہرے پہ تھی معصومیت — جیسے ہو چہرہ حور کا
وہ ایک کامل حسن تھی
خالی ہے جس سے یہ زمیں

"وہ تار نظر کی جنبشیں — نغمات کا ہیں زیر و بم"
"یا اوس میں بھیگی ہوئی — کلیاں ہیں اس کی چشم نم"
"وہ محشر خرامی حسن کی — یا دشت میں آہو کا رم"
"وہ شب رنگ گیسو دوش پر — بکھرے ہیں کیسے خم بہ خم"
تعریف یوں کرتے رہے — وہ صاحبِ جاہ و حشم
آخر کو شاہنشاہ نے — کھائی یہ شاہانہ قسم
اس حسن غمگیں کے لئے — آراستہ ہو اک حرم
بن کر کے ملکہ یہ حسیں
ہو گی مری پہلو نشیں

قلق میرٹھی

عرضی موش محبوس

سنیے فریاد موش غم گیں کی
تھا جو اک موش ان میں قیدی
نامناسب ہے گر کرو دل سخت
سُن کے فریاد قیدی بدبخت
بیٹھا تنہا ہوا ہوں زار و غمیں
قفس تار ہائے آہن میں
ڈر رہا ہوں قریب صبح ہے کیا
پیش لاتی ہے وہ قضا کا لکھا
جوشش آزادگی ہے دل میں اگر
قطع زنجیر ظلم پر ہے نظر
ظلم سے جابروں کے اے لوگو
موشِ آزاد کو رہا کر دو

اور مہماں سرا کو اپنے بچاؤ
داغ مت خون بے گنہ سے لگاؤ
اور نہ ہو ایسی فتح سے خوش دل
جو بہ تزویر تم نے کی حاصل
اک فتوحات پر جو ہے اک شے
جس کی کچھ قدر ہے نہ قیمت ہے
اک ضیافت کی ریزہ چینی خواں
قوت بسری کا ہے مری ساماں
پر بشرطیکہ تم سبھوں کو عزیز
ہو نہ دل پر وہ بخشش ناچیز
نور دل چسپ اور اچھی ہوا
ہیں عطیات و فضل عام خدا
ہونے کل ذی حیات کو وو ذرا
فیض عام خدا سے فیض رہا
تربیت یافتہ دلِ عاقل
رحم کرتا ہے سب پہ الحاصل
چار طرفِ زمانہ اپنی نظر
ڈالتا ہے وہ ایک ہی سب پر
اور سب ذی حیات و حیواں کا
ہی وہ ہمدرد وقت رنج و عنا

اختر جوناگڈھی

شام

ہے وہ ساعت باعثِ فرطِ طرب میرے لئے
جب کہ ہو جاتا ہے دن کی روشنی کا اختتام
اور شعاع مہر بحر پرسکون کی سطح پر
گر کے ہوتی ہیں گداز اس آب دریا میں تمام

آہ! تب وہ خوابہائے عیش کی پرلطف یاد
تازہ کر دیتی ہے پھر ایّام کو پیش نظر مرے
پھر کے پیچھے کی طرف پھر قوّت تخئیل بھی
سرد آہیں بھرتی ہیں فرط غم و اندوہ سے

اور مری خط شعاعی پر نظر پڑتی ہے جب
سوئے مغرب ہے جو سرگرمِ خرام امواج پر

اس مذہب اور شعاعی جادۂ تنویر پر
چاہتا ہوں میں اگر ہو جاؤں سرگرمِ سفر
یہ مجھے لے جائے شاید اچھے رستے کی طرف
پُر تنعّم اور پُر رونق جزیرے کی طرف

(سانیٹ)

ڈاکٹر عشرت انور

سرودِ بقا

۱

عجب تھا کیا ہی بچپن کا زمانہ
کہ ہر شے تھی حقیقت کا خزانہ

ہر اک شاخ و شجر کی دلربائی
تھی ملبوسِ جمالِ کبریائی

ہر اک آبِ روان زمزمہ ساز
"ھوالحق" کی دیا کرتا تھا آواز

ہر اک پتہ میں پتھر میں نہاں تھا
جمالِ دوست ہر شے سے عیاں تھا

حقیقت اب نگاہوں سے نہاں ہے
مذاقِ خوابِ روشن ہی کہاں ہے

جو آتا تھا نظر ہر روز و شب میں
جو کیف افزا تھا ہر لطف و طرب میں

وہ جلوہ رونقِ محفل نہیں ہے
وہ اگلی سی نظر حاصل نہیں ہے

نشانِ دوست میں کچھ بے نشاں سے
جو دیکھا تھا کبھی دیکھیں کہاں سے

۲

دھنک گو اب بھی بنتی ہے فلک پر
چمن میں گل بھی کھلتے ہیں مہک کر

بہت ہی جانفزا ہے ماہِ انور
نہ ہو جب کوئی بھی اختر فلک پر

بہت ہے دلکشا دریا کا منظر
جب اس میں منعکس ہوں ماہ و اختر

نظر افروز ہے ان سب سے بڑھ کر
فروغِ جلوۂ خورشیدِ خاور

مگر وہ زینتِ محفل کہاں ہے
وہ ذوقِ گوش و چشم و دل کہاں ہے

ہر اک شے میں کسی شے کی کمی ہے
قبائے دہر گویا ماتمی ہے

مرا دل بھی انھیں کا ہم نوا ہے
یہی طوفاں مرے دل میں بپا ہے

ہوں ان کے ساتھ جشنِ عیش میں غرق
خوشی کا تاج گل ہے زینتِ فرق

میں ان کا ذوقِ مستی جانتا ہوں
میں ان کی سب خوشی پہچانتا ہوں

فدائے ذوقِ حُسنِ یار ہیں یہ
جمالِ دوست سے سرشار ہیں یہ

خدا ناکردہ ایسا وقت آئے
کہ میرے دل پہ بدلی غم کی چھائے

کبھی ایسا نہ ہو میں بھُول جاؤں
جمالِ دوست فطرت میں نہ پاؤں

زمیں آراستہ ہو رنگ و بو سے
فضا بھی مہکی ہو اللہ ہو سے

کہیں وادی میں ہوں لڑکے خراماں
کبھی توڑیں چمن میں جا کے کلیاں

مُبادا اس گھڑی چشمِ تماشا
رہے حُسنِ ازل سے ناشناسا

فلک پر مہرِ انور ہے چمکتا
ہے ماں کی گود میں بچّہ ہمکتا

نوائے عہدِ طفلی سُن رہا ہوں
خوشی کے پھُول پھر سے چن رہا ہوں

مجھے وہ یاد ہے جب اس شجر پر
ہوا تھا نورِ فطرت جلوہ گسُتر

اسی اک پیڑ پر کیا منحصر تھا
ہر اک پتہ ورق تھا معرفت کا

وہ سبزہ زار جو ہے لہلہاتا
اسی کی یاد ہے اب تک دلاتا

یہ دونوں اس کے جلوہ کے نشاں ہیں
مگر اب ہجر میں ماتم کناں ہیں

نظر آتے نہیں پہلے سے انوار
جو ذوقِ درد کو کرتے تھے بیدار

یہی رونا یہ نرگس رو رہی ہے
جو اس دم میرے قدموں میں پڑی ہے

کدھر ہیں جلوہ ہائے خوابِ پرزور
چمک سے جن کی جاگا تھا مقدر

فضا میں چہچہاتے ہیں پرندے — زمیں پر میمنے ہیں رقص کرتے
دہل کی چوٹ وجہ بیخودی ہے — ہر اک انداز میں ان کے خوشی ہے
بس اک میں ہوں کہ تصویر الم ہوں — خیال رفتہ سے پابند غم ہوں
مگر ہاں اک خیال ایسے میں آیا — کہ جس سے قلب نے آرام پایا
مری ہستی ہے اس سے جگمگاتی — مری فطرت ہے ذوق زیست پاتی
مری ہستی ہے جب خود جزو فطرت — مجھے حاصل نہ ہو کیوں کر مسرت
یہ جوئے آب کی نغمہ طرازی — کہ پتھر کر رہے ہیں نے نوازی
ہر اک جانب مسرت کے ہیں ساماں — ہے میرے درد کا بھی اس میں درماں
صدائیں آ رہی ہیں کاخ و کو سے — فضائیں کھیلتی ہیں رنگ و بو سے
ہواؤں میں بہار بے خزاں ہے — کہ جن میں عہد طفلی بھی نہاں ہے
زمانہ اس طرح محو خوشی ہے — کہ بحر و بر میں رقص بے خودی ہے
چرندے پھرتے ہیں یوں شاد ہو کر — کہ بچے جس طرح آزاد ہو کر!
چلیں مکتب سے جب چھٹی مناتے — خوشی سے رقص کرتے گیت گاتے
حقیقت کو مگر پہچانتا ہے! — تو بالک! لطف ہستی جانتا ہے
گڈریئے! اب ذرا اک گیت گا لے — مری عمر گذشتہ کو بلا لے

۴

یہ ہر شے کا خوشی سے مسکرانا — مسرت خیز ہر اک کا ترانا
یہ سب کچھ سن رہا ہوں میں بھی پیہم — شریک عیش و عشرت ہیں دو عالم

کیفی دہلوی

راز و نیاز محبت

آہ میں کیوں اس قدر ہوں مضطرب اور دل حزیں
چین ہے ہے! کیوں کسی پہلو مجھے پڑتا نہیں
نیند آنکھوں سے اُڑی دل سے مسرت کھو گئی
اضطرار شام فرقت بس قیامت ہو گئی

کیا ہے وہ جو باعث درد دل جاں کاہ ہے
بات کہتا ہوں مگر منہ سے نکلتی آہ ہے
ہو نہ ہو زخمی مجھے یہ عشق قاتل کر گیا
تودۂ تیر بلا و رنج و غم دل کر گیا
اور دل خستہ کو ایک جھپکی میں بسمل کر گیا

کھب گیا دل میں خدنگ عشق پہلو چور ہے
ہے تسلط عشق کا آرام دل سے دُور ہے
ہاں میں سرتابی کروں یا رکھ دوں اب خنجر پہ سر
ہے رہ تسلیم واجب، سینہ کرنا ہے سپر

ہے محبت میں مناسب راہ تسلیم و رضا
صبر ہی سے بوجھ ہوتا ہے سبک آلام کا

شعلہ حرکت سے بھڑکتا ہے نکلتے ہیں شرر
دم میں ہو جاتا ہے سرد اس کو نہیں چھیڑو اگر
پیش پا افتادہ کو تو عشق ٹھکراتا نہیں
جو سمجھے، لیکن کبھی رحم اس پہ یہ کھاتا نہیں
سر ہے حاضر اے محبت! عفو کرا گلی خطا
بخش دے اور درگزر کر دے جو بے جا ہو گیا
یہ زبردستی ہے کس پہ؟ میں ہوں حاضر سر بکف
بزدلی ہے گردن خم پر ہو گر خنجر بکف
ہاں ذرا انصاف دلبر! شرط اُلفت ہو ادا
یا مجھے ترک محبت کا سبب اصلی بتا
سرد مہری اور سلوکوں کا ترے شکوہ نہیں
میں کبھی حرف شکایت لب تلک لایا نہیں
میں نے مژدہ شادمانی کا نہیں دل کو دیا
ہونے والا ہے کبھی تو فضل شاہ عشق کا
کر قبول اس کو رہے جو عمر بھر تیرا غلام
سوز جس دل میں رہے گا، جانثاری کا مدام
میں کہ مانا صاحب حشمت نہیں، نامی نہیں
نذر ہے جو پاس ہے وہ بھی تو خستہ اور حزیں
ہے مگر امداد سلطانِ محبت کی مجھے
اور وہی اک دن کرے گا مہرباں محبوب تجھے

پروازِ تخیل

پھولوں کی پتیاں ہیں ہم آغوش خواب سے
سرو روان چمن کے ہیں ساکت کھڑے ہوئے
ندی کی موجیں تھک گئیں روپوش ہو گئیں
سب مچھلیاں جو پھرتی تھیں خاموش ہو گئیں
جگنو ہیں صرف شب کی خموشی میں ہوشیار
اے کاش میرے پاس ہو وہ جانِ نوبہار
تارے زمیں کو کہہ رہے ہیں ضیا بدوش
نظارہ کر رہا ہوں ترے دل کا میں خموش
گردوں سے ٹوٹتا ہے جو تارہ کوئی کبھی
رہتی ہو آسمان پہ کرن ایک نور کی
بیمار دل کے گوشۂ رنگیں میں آج بھی
باقی ہے صرف ایک جھلک تیرے حسن کی
دامن میں جھیل کے ہے کنول غیرتِ بہار
مست شباب کیف جوانی سے پرخمار
آ تو بھی بے وفا مرے آغوش میں شوق میں
ہستی کو کر فنا مرے آغوشِ شوق میں

منورؔ لکھنوی

فریب خیال

تری چٹکی میں تھا وحشت زدہ اک پھول صحرائی
لبوں میں جس کو تو نے بے نیازی سے دبا ڈالا
ادا سے نوچ ڈالیں پتّیاں سب قرمزی جس کی
وہ میرا قلب مضطر تھا وہ میرا قلب مضطر تھا

تری چٹکی میں تھا اک جام مے اے دست جانانہ
اٹھا کر ناز سے جس کو لبوں تک جرعہ نوشی کی
لگا کر قرط دے پٹکا جسے پھر مثل بیگانہ
وہ میری روح مضطر تھی وہ میری روح مضطر تھی

رسالہ "زمانہ" کانپور اپریل ۱۹۲۸ء

نظم طباطبائی

دولتِ خداداد افغانستان

کشورِ افغاں ہے، پن چکی میں مٹھی بھر اناج
اور ندی آ رہی ہے دیکھنا کس شور سے
کوئی دم میں پس کے رہ جائے گا آٹے کی طرح
سنگ بالا ہو کہ زیریں جب پھرے گا زور سے

حکم نامے اس طرف یہ لکھ رہے ہیں والسرائے
حکمرانی میں نہ چھوڑو عدل اور انصاف کو
روسیوں کو اس طرف کہتا ہے وہ للکار کر
دم ذرا لو، آپ سے باہر نہ ہو، منہ دھو رکھو

پھر یہ کہتا ہے کہ حالت دولتِ اسلام کی
ہے دگرگوں آ رہی ہے اب صدائے الرحیل
اب تباہی کے مجھے آثار آتے ہیں نظر
کیا مجھی پر خاتمہ ہونا ہے اب ربِّ جلیل

راہ دکھلاتی ہے مالک کی مشیت اور کچھ
اور بندہ کا سرِ تسلیم ہے ہر وقت خم
کافروں سے کیا اعانت لے کے میں ذمی بنوں
کیا سمجھ کر منہ میں اژدر کے بھلا رکھوں قدم

سابقہ جس کو پڑے کابل کے حل وعقد سے
اس سے بڑھ کر مستحق تائیدِ غیبی کا نہیں
حکمراں جو قوم افغاں پر ہو دم بھر کے لئے
جو مصیبت اس پہ ہے کب ہے وہ عالم میں کہیں

دیکھتا ہوں میں جہاں تک کام کرتی ہے نظر
قلعۂ کابل سے لے کر دامنِ کہسار تک
چوٹیوں پر جن پہاڑوں کی ہیں توپیں آتشیں
برف کی جن کو ہساروں سے نمایاں ہے چمک

جس قدر وادی ہیں سب شاداب ہیں سیرآب ہیں
چھپ گئے ہیں وار بستہ تاک سے میدان سب
لوگ اپنے دل میں کہتے ہوں گے جنت ہے یہ ملک
سچ اگر پوچھو تو دوزخ سا مجھ پر ہے تعب

طالب بنارسی

مال اور مار

پانی کو جیسے دنیا میں حاصل استقرار نہیں
مال جہان کو بھی ویسے ہی ہرگز استقرار نہیں

پانی کے بڑھ جانے سے جس طرح خرابی آتی ہے
مال کی کثرت بھی آخر کو یونہی خرابی لاتی ہے

پانی کو رکھ چھوڑو تو پانی ضائع ہو جاتا ہے
مال کو بھی رکھ کر منعم اکثر نقصان اٹھاتا ہے

پانی سے ہر زمین اچھی بری سمجھ میں آتی ہے
مال جہاں سے سخا بخالت کی قلعی کھل جاتی ہے

پانی جیسے قطرہ قطرہ آتا ہے اور جاتا ہے
مال بھی یونہی مشکل سے آکر جلدی اٹھ جاتا ہے

پانی سے جس طرح زمیں کے گڈھے سب بھر آتے ہیں
مال سے بھی منعم کے سارے عیب نہاں ہو جاتے ہیں

پانی جیسے بیش کہیں اور کسی جگہ کم ہوتا ہے
مال کا بھی اس دُنیا میں ایسا ہی عالم ہوتا ہے

پانی جیسے کوئی گندہ، کوئی طاہر ہوتا ہے
مال بھی آخر یونہی حرام اور حلال ظاہر ہوتا ہے

پانی سے جس طرح نجاست برسوں کی دھو جاتی ہے
مال سے بھی معصیت بشر کی پاک یونہی ہو جاتی ہے

"زمانہ" کانپور جون ۱۹۰۶ء

سفیر

عہدِ گل

عجب سماں ہے یہ ہمدم بہار کا آغاز
ہوائے باغ میں ہے اک فسونِ پردہ ساز

عروسِ دہر پہ اب حرفِ شادمانی ہے
دکھا رہی ہے نیا روپ اور نئے انداز

بنی ہے خاکِ چمن آج آستانِ صنم
کہ ڈالیاں ہیں جھکائے ہوئے جبینِ نیاز

نئی نئی نکل آئی ہیں کونپلیں ہر سمت
طرب فزا ہے تماشائے چرخِ شعبدہ باز

چمن میں نرگس و بادام ہیں پھلے پھولے
کنارِ آبِ رواں نیلوفر ہے جلوہ طراز

کھلا ہوا ہے جو پھول اک انار رنگیں
بنا ہے لعلِ یمن طرۂ بتِ طنّاز

عجب مزا ہے کہ ہر سو منا رہی ہیں بسنت
پری رُخان ستم پیشہ و سراپا ناز

خبر ہے تجھ کو بھی ہمدم بہار آئی ہے
بھری ہے دور جہاں میں نوائے نغمہ و ساز

نسیم صبح معطر ہے نکہت گل سے
خوشی سے خود روش روزگار ہے دمساز

ہوائیں چل رہی عطر بیز گلشن میں
حرام ہو گئی نیند اب کہاں وہ خواب ناز

جو دیکھنا ہو ذرا سیر باغ دُنیا کی
جو چاہتے ہو کہ دم بھر ہو چشم بینا باز

چلو اٹھو کہ جہاں وقف کامرانی ہے
"زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"

"زمانہ" کانپور مارچ ۱۹۱۰ء

ضامن کنتوری

زندہ دلی

مطلع کثیف منظر صحرا تھا سامنے
میں گشت کر رہا تھا پہاڑوں کی راہ میں

ہمراہ ایک طفل تھا بشاش و شادکام
کچھ امتیاز جس کو نہ تھا واہ واہ میں

مشغول کھیل کود میں تھا طفل زندہ دل
ڈوبا تھا پیر مرد تفکر کے چاہ میں

چھایا ہوا تھا ابر الم میرے قلب پر
اب تک نمی تھی اشکوں کی چشم سیاہ میں

ایک پھول ایک پتا اور ایک کنکری لئے
وہ طفل خوش تھا پا کے غنیمت سیدا ہمیں

دولت یہ اس کے حق میں تھی ایسی گراں بہا
تھی سلطنت سے بڑھ کے جو اس کی نگاہ میں

ہر بار دوڑ دوڑ کے آتا تھا پاس وہ
اپنا خزانہ مجھ کو دکھانے کی چاہ میں

پر اس قدر دماغ کہاں تھا کہ اس گھڑی
دلچسپیاں ہوں کچھ مجھے سنگ و گیاہ میں

یہ بھی نہ ہو سکا کہ ملامت کروں اسے
اتنی بھی تھی دکھائی نہ قلب سیاہ میں

مجبور ہو کے میں متوجہ ہوا ادھر
دونو کے دونو تھم گئے اک لحظہ راہ میں

رہبر سے اپنے کہنے لگا تب وہ طفل شوخ!
عزت بہت تمہاری ہے سب کی نگاہ میں

شہرہ ہے سارے شہر میں علم و کمال کا
سب دم تمہارا بھرتے ہیں ہر درس گاہ میں

دیکھو ذرا براہ کرم ان کو کیا ہیں یہ
ماہیت ان کی سمجھو گے تم اک نگاہ میں

دیکھا جو میں نے سن کے یہ تقریر اس طرف
بس محو تھا نظارہ صنع الہ میں

چیزیں وہی تھیں معدن حکمت نظر میں اب
جن کو کھلونے سمجھا تھا میں اشتباہ میں

تھا فلسفہ لکھا ہوا علم نبات کا
اس اک ذرہ سے صفحہ برگ گیاہ میں

دیتا تھا اگلے وقتوں کے طوفان کا پتا
وہ سنگ جم کے سخت ہوا تھا جو راہ میں

معیارِ سینس میں ہیں یہ ہم سنگ لعل و دُر
گو کس مپرسیوں سے ہوں حال تباہ میں

ایک ایک سنگریزہ ہے تاریخ روزگار۔
اکسیر کے صفات ہیں ہر برگ کاہ میں

فطرت کا بے بہا یہ خزانہ سب اسطرح
اطفال پر ہے وقف مسرت کی راہ میں

لیکن ملول دل کا جہاں میں یہ رنگ ہے
رہتا ہے محو اپنے ہی حال تباہ میں

اے وہ کہ جس کی نعمتیں دُنیا میں عام ہیں
رکھتا نہیں قدم کبھی غم جس کی راہ میں

سمجھوں کہ تیرا شکر ہوا مجھ سے کچھ ادا
ہو جلوہ گر جو نورِ مسرت جباہ میں

ارمغان فرہنگ ۱۹۰۱ء

شفیق کاکوروی

حالتِ وجد

انبساطِ دہر سے آنکھیں جو ہیں آسودہ حال
اب جھپک جائیں خدایا دیکھ کر برقِ جمال

ہاں ملے وہ بوسہ جو مہرِ لبِ خاموش ہو
کیوں زبان منت کشِ گفتار ویا جوش ہو

فرحت جاں بخش سے کر دے سبک سر روح کو
غم کے ہاتھوں سے بچا میرے دلِ مجروح کو

بارِ غم سے دل مرا اک غنچۂ دلگیر ہے
آبِ باراں سے فشارِ گُل کی یا تصویر ہے

بس اب اتنی التجا ہے تجھ سے اے ربِ قدیر
شادماں کر دے مجھے دکھلا کے حسن دلپذیر

"زمانہ" کانپور مئی۔ جون ۱۹۳۶ء

حامد علی خاں

محبت

محبت روح جسم عارضی ہے — محبت زندگی کی زندگی ہے
محبت غایت الغایات ہستی — محبت حق نما ہے حق رسی ہے

کبھی بھولے سے بھی مجھ کو نہ بھولے — وہ ساعت جس کی یاد دلربا ہے
غذا ملتی ہے اس روح حزیں کو — مزے لیتا ہے یہ دل انتہا کے

سر کہسار میں لیٹا ہوا تھا — سہانی شام تھی اور چاند نا تھا
مری پیاری مرے دل کی تمنا — وہیں بیٹھی تھی اور وہیں گا رہا تھا

نہیں تھا آشنائے سوز پنہاں — مری امید کا مرکز مری جاں
وہ مجھ پر مہرباں ہوتی ہے سن کر — وہ گانے جن سے دل ہو وقف حرماں

پرانا راگ اب اک میں نے گایا — اسے اک قصہ حرماں سنایا
رہے ذوق نظر کا بھید پا کر — حیا نے اس کی آنکھوں کو جھکایا

یہ تھا افسانہ اک دردآشنا کا — اور اک محبوبۂ سنگین ادا کا
محبت میں گھلا وہ سالہا سال — مگر پگھلا نہ دل اس بے وفا کا

مری دھیمی مری غمگین صدائیں — مری افسردہ و محزوں نوا میں
سفارش اپنی الفت کی چھپی تھی — ہر اک انداز میں ہر اک ادا میں

کہا میں نے یہ اندوہ محبت — ہوا دیوانہ وہ برگشتہ قسمت
بنایا اس نے مسکن جنگلوں میں — ہوئی ہر روز بدتر اس کی حالت

قیامت لیکن اب بھی ڈھا رہا تھا — تصور ہر طرف اس بے وفا کا
گھنے سایوں میں غاروں میں ہر اک سمت — وہی تھی جس طرف وہ دیکھتا تھا

پھر اک دن اتفاقِ ناسزا سے — پڑی وہ ظالموں کے ہاتھ آکے
یہ اپنی جان پر کھیلا اور اس کو — بچایا موت سے بدتر سے

وہ پچھتائی مگر بے کار تھا اب — بنی غم خوار لیکن بے اثر سب
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی — گئی جاں بھی جنوں رخصت ہوا جب

بہت روئی بہت تڑپی مگر کیا — علاج اک کشتۂ تیر قضا کا
مری پیاری مری شیریں ادا پر — اثر اس گیت کا جانے ہوا کیا

ملا اک غازۂ سرخ اس کے رخ پر — حیا اور جذبۂ الفت نے مل کر
پھر اک دھیمی سی خوابیدہ صدا میں — مرا نام آگیا اس کے لبوں پر

محبت رحم بن کر رو رہی تھی — مرا نام آگیا اس کے لبوں پر
مرے پاس اٹھ کے آئی اور اچانک — وہ ہم آغوش مجھ سے ہو رہی تھی

غرورِ حسن و اظہارِ محبت — حضورِ عشق اقرارِ محبت
بنے اس طرح ہم دونوں تن و جاں — بنا ہوں حسن غم خوارِ محبت

ارشد صدیقی

گاؤں کا لوہار

یہ جو موضع میں ہے اخروٹ کا پھیلا ہوا پیڑ
کارخانہ ہے لوہاری کا اسی کے نیچے
اور لوہار ایک جسیم اور قوی مرد ہے وہ
ہاتھ میں جس کے دراز اور نہایت مضبوط
اس کے پرزور جواں بازو کا اک اک عضلہ
اس قدر سخت ہے جیسے کوئی فولاد کی چھڑ

اس کے شب رنگ وسیہ بالوں میں سختی کی نمود
اس کے تپتے ہوئے چہرے پہ مشقت کی کرن
اور ماتھے پہ ہے محنت کے پسینے کی نمی
جو بھی ہو سکتا ہے اس سے وہ کما لیتا ہے
سارے عالم سے ملا سکتا ہے اپنی نظریں
کیوں کہ دنیا میں کسی کا بھی وہ مقروض نہیں

صبح سے رات گئے تک یونہی پورا ہفتہ
دھونکنی اس کی بھرا کرتی ہے لمبی سانسیں
اٹھتے گرتے ہوئے اک بھاری ہتھوڑے کی کھنک
کرتی رہتی ہے بلند اپنی مسلسل آواز
گاؤں میں جیسے "گرزوار" سدھے ہاتھوں سے
شام کے وقت بجاتا ہے کلیسا کا گجر

بچے اسکول سے جاتے ہوئے گھر کی جانب
اس کے دروازے پہ آ کے ٹھہر جاتے ہیں
دیکھتے ہیں وہ بڑے چاؤ سے بھٹّی کی دمک
دھونکنی کی بھی صداؤں کو سنا کرتے ہیں
اور پکڑ لیتے ہیں چنگاریاں خوش ہو ہو کر
جو اڑا کرتی ہیں کھلیان کے بھوسے کی طرح

گاؤں کے گرجے میں بھی جا کے ہر اتوار کو وہ
بیٹھ جاتا ہے کہیں اپنے ہی لڑکوں کے قریب
پادری کی بھی وہ تبلیغ پہ رکھتا ہے نظر
اپنی لڑکی کی بھی آواز سنا کرتا ہے
گایا کرتی ہے جو گرجا میں مقدس نغمے
اور کر لیتا ہے یوں دل کو وہ اپنے مسرور

اس کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس کی بیوی
باغ فردوس میں ہے بیٹھی ہوئی نغمہ سرا
کرنا پڑتا ہے پھر اک بار اسے یہ بھی خیال
کہ وہ کس طرح پڑی ہوگی لحد کے اندر
پھر وہ آنکھوں سے ٹپکتا ہوا کوئی آنسو
سخت اور کھردرے ہاتھوں سے رگڑ لیتا ہے

کبھی محنت کبھی خوشیاں، کبھی رنج و آلام
یوں رہِ زیست میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
صبح کر دیتا ہے ہر روز کوئی کام شروع
شام کو کر کے دکھا دیتا ہے اس کی تکمیل
اور اسی کوشش و محنت اسی تکمیل سے وہ
رات بھر کے لئے اک نیند کما لیتا ہے

شکریہ تیرا کہ تو قابل تعظیم ہے دوست
تجھ سے ملتا ہے ہمیں کتنا بڑا درس حیات
زندگانی کی دہکتی ہوئی اس بھٹی میں
ڈھال سکتے ہیں یونہی ہم بھی مقدر اپنے
اور کھنکتی ہوئی اس دل کی نہائی پہ یونہی
اپنے تخئیل و عمل ہم بھی بنا سکتے ہیں

فضل الرحمٰن

قید خانہ

جاوداں اے روح آزادی اے شمع حریت
ظلمت زنداں میں روشن ماہ تاباں کی صفت

ہے یہ ویراں خانۂ دل دائمی مسکن ترا
جس میں رہ سکتا نہیں جہاں کوئی تیرے سوا

تیرہ حجروں میں ترے فرزند جب ہوتے ہیں قید
تیرہ حجروں اور زنجیروں جب پھنستے ہیں صید

بنتی ہے زنجیر کی جھنکار خود دل کی پکار
گونجتی ہے بام و در میں روح بسمل کی پکار

خاک و خوں میں وہ پاٹ دیتی ہے تقدیر وطن
ہو کے خود برباد کر دیتی ہے تعمیر وطن

کتنے آزادوں کے حق میں قید خانہ کعبہ ہے
سنگ در زنداں کا کتنے خود سروں کا قبلہ ہے

سایہ رحمت رہے تا روز حشر اس بام پر
طالب انصاف ہے جو گھر خدا کے نام پر

عزیز نظمی

اندھے اور ہاتھی

چھ اندھے تھے ہندوستانی — دھن کے تھے وہ ودیا گیانی
دیکھنے وہ ہاتھی کو نکلے — گرچہ سب تھے بالکل اندھے
باری باری سب نے پرکھا — ہاتھ لگا کر ہاتھی بوجھا

جھٹ سے پہلا اندھا دھمکا — دھم سے لڑھکا کر کے سنبھلا
پھر ہاتھی کی بھر کم چھاتی — چھو کر چلاّ اٹھا ہاتھی
ہاتھی کیا ہے رام دہائی — ایک بڑی دیوار ہے بھائی

ہاتھی کے جب دانت کو پکڑا — نمبر دو کا اندھا بولا
گول سا، لانبا، چکنا چپڑا — اور نکیلا بھالے جیسا
کیا دیکھو ہے رام کی لیلا — ہاتھی بالکل بھالے جیسا

تیسرے کی جب باری آئی   اس نے بُدھی خوب لگائی
پھر ہاتھی کی سُونڈ کو چھوکر   جھُوم اٹھا اس کے مڑنے پر
چھاتی ٹھونکی اور چلّایا   ہاتھی نا ہے، سانپ ہے بابا

چوتھا بولا گُھٹنے چھُوکر   نیارے جگ کا دیکھ جناور
ہم سے وِدّیا کرلو دھارن   اس گتھّی کا پوچھو کارن
ہاتھی کی گت ہم سے پوچھو   ایک تنا سا پیڑ کا سمجھو

پھر کانوں پر ہاتھ لگایا   بولا نمبر پانچ کا اندھا
اندھا جب بن دیکھے بوجھے   ڈر سے کو پھر دیکھ نہ سُوجھے
ہلتا ہے وہ ڈولے ڈولے   ہاتھی کو پنکھا ہی سمجھ لے

چھٹّے نے پھر کھوج لگائی   دُم ہاتھی کی ہاتھ جو آئی
بَل کھاتی دُم جھوم رہی تھی   چھُوکر بولا یہ لو ہاتھی
ہاتھی کیا ہے اک چھوٹی سی   رسّی گویا ہے بَل والی

یہ اندھے سب ہندوستانی   بات تھی ان کی سب کی سچّی
برسوں ان کو لڑتے دیکھا   بات پہ اپنی اڑتے دیکھا
گرچہ ہر اک بات پہ سچ تھا   سچ تھا جھوٹا مل کر سب کا

دھرم کے یُدھ میں لڑنے والے ایشور اللہ کے متوالے
سب نے رستہ ڈھونڈ نکالا سب کا سچا، لیکن نیارا
جیسے ہاتھی ان اندھوں کا کھوٹا مِل کر، سب کا سچ تھا

فانی بدایونی

یاد

میں ہوں فسردہ اک کلی گزری ہوئی بہار کی
جدول دلفریب ہوں صفحۂ روزگار کی
درد بھری اک آہ ہوں تب امیدوار کی
خاک ہوں میں جلی ہوئی عشق کے شعلہ زار کی

یاد بھی ہے میں کون ہوں؟

مرہم زخمہائے دل چارۂ درد زندگی
غم بھی نصیب غم بھی ہوں راز بلند و پست کی
جمع ہے میرے سایے میں دور کہن کی ہر گھڑی
میں ہی تو سجدہ گاہ ہوں ماضی ناگزشتہ کی

یاد بھی ہے میں کون ہوں؟

میں ہی ہنسی خوشی کے دن میں ہی گھڑی ملال کی
میرا ہی طاقِ بےخودی قبر ہے ہر خیال کی
خندۂ شادکام ہوں آہِ شکستہ حال کی
میں ہوں صدائے بازگشت نغمہ لازوال کی

یاد بھی ہے میں کون ہوں؟

حلقۂ زلفِ شب ہوں میں سلسلۂ سحر بھی میں
میں ہوں وجودِ کائنات موت سے بےخبر بھی میں
میرا ہی نام کل بھی ہے آج کا مستقر بھی میں
زیست بھی میں فنا بھی میں خُلد بھی میں سقر بھی میں

یعنی میں اس کی یاد ہوں

سفیر

لکھنؤ کی ریذیڈنسی میں
جیسی کا خواب
(غدر ۱۸۵۷ء کا ایک سین)

دور و دراز ہے اسکاٹ لینڈ پیارے
یاد آرہے ہیں لیکن تیرے وہ سب نظارے

تصویر بن گیا ہے دل میں وہ گھر کا نقشہ
آنکھوں میں پھر رہا ہے شام و سحر کا نقشہ

چرخہ چلا رہی ہے دن رات گھر میں ماما
کھیتوں کے سینچنے کو تڑکے گئے ہیں پاپا

گائیں وہ چرتی پھرتی ہیں دور وادیوں میں
پاپا نظر سے اوجھل ہیں ان پہاڑیوں میں

زانو پہ تیرے بی بی لیٹی ہوں سر کو رکھے
لیکن ابھی یہ میں نے کیا کیا ہیں خواب دیکھے

نظروں کے سامنے ہیں بچپن کے سب تماشے
پردیس میں یہ آکر کیسے اٹھائے صدمے

پیش نظر ہے سارا سسرال کا گھرانا
یاد آرہا ہے اپنی شادی کا وہ زمانا

شوہر کے ساتھ اپنے سیر کنار جو کی
خوشبو وہ بھینی بھینی گلہائے ناز بو کی

باتیں وہ میٹھی میٹھی الفت کے سب کرشمے
سنسان جنگلوں میں وہ بانسری کے نغمے

یادِ وطن میں اب دل ہے داغ داغ میرا
چکرا گیا ہے غم سے اس دم دماغ میرا

دیکھو تو ہو گیا ہے سچا یہ خواب میرا
ہر لحظہ بڑھ رہا ہے اور اضطراب میرا

آہا وہ آ رہی ہے آواز بانسری کی
دل سے فدا ہوں میں اس طرزِ نواگری کی

مینار مسجدوں کے اور خوش نما شوالے
ٹکرا کے سب سے آئے ہیں بانسری کے نالے

لو آگئیں وہ فوجیں سر کیمبل کی رم جھم
توپیں گرج رہی ہیں برپا ہے شور و یلکم

اپنی مانہ کو آئی آراستہ یہ پلٹن
گلزار آرزو میں آئی بہار گلشن

آواز بانسری کی میں نے سنی بھی جب تک
وہ لو سپاہیوں نے دی در پہ آکے دستک

مدت کے بعد چمکا قسمت کا اپنی تارا
جینے کا مل گیا ہے ہم سب کو اب سہارا

بیداد آسمان نے کیسا ہمیں ستایا
آخر سپاہیوں نے اس قید سے چھڑایا

کی بہادروں نے کیسی یہ جان نوازی
دل سے کریں گے ہم بھی مہماں نوازی

لشکر کا ہر سپاہی ہے مستحق دُعا کا
سر پہ ہمیشہ ان کے سایہ رہے خدا کا

"زمانہ" جولائی ۱۹۱۱ء

اسمٰعیل ریفعی

مغ کی مسافرت

"وہ شام، شامِ زمستاں، سفر شدید طویل
وہ سال بھر کا نکمّا سمے بسانِ سفر
وہ کاٹتا ہوا جاڑا، وہ راستے اوجھل
حدِ عروج کو چھوتا ہوا کڑا موسم"
تھکن میں، آبلہ پائی میں چڑچڑائی ہوئی
پگھلتی برف میں پاؤں پسارے اونٹنیاں
وہ تھا مقام جہاں ہم ملول و زار بنے
ستا رہا تھا ہوا دارِ مسکنوں کا خیال
بلندیوں کی رہائش، برآمدے ڈھلواں
گداز جسم، وہ شربت بہ کف حسینائیں
یہ مرحلہ کہ جسے ساربان بھی کوس پڑے
سوادِ شہر میں کچھ اور سیر کر پاتے
نہ اک شراب کی چسکی نہ کچھ وصالِ صنم
نہ سائباں کوئی سر پر جو رات بھیگ چلی

یہ راکھ جمتی ہوئی آتشِ فروزاں کی
عدو ہیں شہر تو نامہرباں ہیں یا قصبے
یہ خستہ قریوں میں ہر چیز کی گراں قدری
کڑے سمے سے پڑا تھا ہمارا پالا مگر!
چلو کہ رات کا چلنا بھی اب گوارا تھا
کبھی تو اونگھ چلے اور کبھی چلے بیدار
سحر میں اپنی حماقت کو گنگناتے ہوئے
کچھ آگے صبح کے تڑکے میں ایک وادی تھی
فضا بھی بھینی، ہوا معتدل، زمین گیلی
اک آبنائے خرامیدہ سبزہ زاروں میں
سکوتِ شب کو ترنم وہ دیتی ہیں چکی
درخت تین، جھکے آسماں کو چھونے سے
تو سبزہ زار میں اسپِ سپید کی سرپٹ
ہمیں کچھ آگے ملا اک شراب خانہ بھی
جھکی پڑی ہوئی چوکھٹ پہ تاک کی بیلیں
وہ پاسہ سازی، وہ ڈیوڑھی وہ تین بازیگر
قدم شراب کی چھاگل یہ کھٹکھٹاتے ہوئے
کسی نے کچھ نہ خبر دی تو بڑھ گئے آگے
چلے تو شام کو ایسے مقام پر آئے
جہاں پہنچ کے تسلی کہو جسے وہ ملی
جو نقش ذہن ہے وہ ماجرا ہے پارینہ

سُنا رہا ہوں کہ ثبت دوام بن جائے
جو اتنی راہ کٹی سختیاں اٹھائے ہوئے
نکل پڑے تھے حیات و ممات کے درپے
ہمیں تو ایک جنم کا ثبوت ملتا ہے
نظارے دیکھے ہیں یوں موت و زیست کے میں نے
سمجھ رہا تھا کہ موت و حیات ہیں بے
مگر حیات تو جاں کن تھی موت سے بھی سوا
ہم اپنی مسکنت و سلطنت کو لوٹ آئے
مگر یہاں تو وہی ہے نظام فرسودہ
یہاں کے لوگ مجھے اجنبی سے لگتے ہیں
پڑے ہیں چھٹے ہوئے گھن لگے خداؤں سے
اک اور عدم کے سفر سے مجھے خوشی ہوگی

تلوک چند محرومؔ

زوالِ حُسن

معشوقہ تری ہو تجھ سے کم حسیں
ورنہ دو چار عشق کے دن
عورت کو سمجھ گلاب کا پھُول
پرّاں ہے شمیمِ گل یہ مت بھول
گل کھل کے جو تا کمال آیا
گویا وقتِ زوال آیا
گرنے لگیں پتّیاں زمیں پر
صادق ہے یہ حسنِ نازنیں پر

منور لکھنوی

محبت

گزر کر آسماں ان رفعتوں پر کوہساروں کی
ہوا کی طرح سے لہروں پہ چل کر رودباروں کی
اتر کر ڈوب کر چشموں کے اندر تہ نشیں ہو کر
بزیر تربت احباب رفتہ جاگزیں ہو کر
قیامت خیز طوفانوں کی دشواری کو طے کر کے
نشیب آثار چٹانوں کی دشواری کو طے کر کے
وفورِ شوق سے کرتی ہوئی طے منزل صحراء
محبت ہر طرح کرے گی اپنا راستہ پیدا
جہانِ قدرت نے اتنی بھی نہیں رکھی ہے گنجائش
گزر ہو جائے اک ننھے سے جگنو کا باآسائش
جہاں پیدا ہے تنگی سے دل انساں میں حیرانی
نہ اک مکھی بھی پر پھیلا سکے جس میں باآسانی

نہ داخل ہو سکے اک پشتۂ ناچیز بھی جس میں
سمائی ہو نہیں سکتی کسی ذی روح کی جس میں
محبت آ کے اپنے واسطے کر لے گی جا پیدا
محبت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

نہ ہو اقرار شاید تم کو اس کے زور و قوت کا
اسے سمجھو مرقع خواہ طفلانہ نزاکت کا
کرو نفرت سے عائد خواہ الزام فرار اس پر
کہ رکھو بزدلی کا اتہام ناگوار اس پر

اگر محبوب اس کا لاکھ پردوں میں چھپا ہوگا
اگر پہرے پہ پہرا رات دن اس پر لگا ہوگا
محبت کو نہ ڈر کچھ تیغ کا خدشہ نہ خنجر کا
محبت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

گمان اکثر کا ہے تدبیر کر سکتی ہے پست اس کو
کہ ہو جاتی ہے قید و بند سے حاصل شکست اس کو
خیال اکثر کا ہے آنکھیں نہیں ہوتیں محبت کی
عطا قدرت ہی سے نعمت نہیں اس کو بصارت کی

کرو جو دل میں آئے تنگ کرنے کے لئے اس کو
نہ دو رستہ ذرا بھی تم گزرنے کے لئے اس کو
مگر بینا کہو تم خواہ اس کو خواہ نابینا
محبت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

فضل الرحمٰن

سکندر اور مطرب

نظر فروز جشن تھا　　شبانہ زور جشن تھا
عطا کر سکندری　　یہ صد شکوہ داوری
سپاہ و لشکری بہم　　تمام فاتح مجسم
سکندر اور امیر سب　　خراب بادہ طرب
وہ بادشاہ نوجواں　　وہ رشک مہر آسماں
گلابوں کا گلے میں ہار　　بغل میں شوخ گلعذار
تیئس ماہ ضو فگن　　کہ جیسے مشرقی دلہن
مجسمہ شباب کا　　وہ خمکدہ شراب کا
بدن قریب دونوں کے　　خوشا نصیب دونوں کے
وہ شادماں یہ کامراں　　یہ کامراں وہ شادماں
جری یہ دل وہ رخ حسیں　　دلیری یہ وہ نازنیں
صلہ ہے حسن عزم کا　　ہے حسن عزم کا صلہ

ٹموتھیس کہ تھا وہاں چراغ بزم مطرباں
اٹھایا اس نے ساز پھر ہوا نوا طراز پھر
وہ مشتری کی داستاں المپیا کا وہ بیاں
ہوس میں جس کی دیوتا بنا کے بھیس سانپ کا
فروکش زمیں ہوا نثار مہ جبیں ہوا
لبوں سے کیسے پھر وہ لب چمٹ گئے دم طرب
مچل کے سیمیں سینے پر گراں بہا خزینے پر
لپٹ گیا کمر کے گرد نہاں پر ثمر کے گرد
پھول اسس ساذی چاہ کا وجود بادشاہ کا
خوشامدی رئیس کل لگے مچانے شور و غل
فلک کا دیوتا ہے تو خدا ہے تو خدا ہے تو
بھرا دماغ بادشہ خرد پہ چھا گیا نشہ
یقین دل میں بے گماں کہ ہوں میں داور جہاں
نگاہوں میں سرور تھا خدائی کا غرور تھا
بدل دی نغمہ خواں نے لے سنایا ذکر جام و مے
وہ دل نشیں داستاں خدائے عیش کا بیاں
وہ دیوتا شباب کا وہ آتشہ شراب کا
بجاؤ شادیانے اب سناؤ تم ترانے اب
وہ آگیا وہ آگیا وہ انجمن پہ چھا گیا

قدح کشوں کا دیوتا — جواں حسیں خوش ادا
اسی سے رسم مئے کشی — یہ بے خودی یہ بے ہشی
پیا ہی جس سے مست ہیں — جری قدح بدست ہیں
لگا وہ شاید جھومنے — لب سبو کو چومنے
زباں پہ قصہ فتح کا — نظر میں نشہ فتح کا
یہ دیکھ کر تموتھیس — وہ مطرب فسوں نفس
لگائی اس نے تان اور — کہ بدلے بادشہ کے طور
تباہیوں کی داستاں — شکست دار کا بیاں
وہ تاجدار بحر و بر — وہ حکمراں خشک و تر
وفور رنج و یاس سے — کشا کش ہراس سے
پڑا تھا خاک پر نڈھال — غم جہاں سے خستہ حال
نہ کوئی دوست آشنا — نہ کوئی یار با وفا
ہوا شکستہ دل بہت — الم سے مضمحل بہت
تھا مطمئن یہ دیکھ کر — وہ سحر کار نغمہ گر
سمجھ گیا وہ سلسلہ — محبت اور رسم کا
سکندر اس ترانے پر — تباہی کے فسانے پر
چھڑی نوائے عشق پھر — جبیں صدائے عشق پھر
کہ زیست شمع بزم ہے — بساط مرگ رزم ہے
ہے شہرت اک حسین خواب — نوید فتح اک سراب

ہیں جنگ میں مصیبتیں　　تباہیاں ہلاکتیں
نہیں جو جشن جیت گیا　　لڑائی کی وہ ریت گیا
ہے جب تیئس پہلو میں　　تو کیوں یہ ٹیس پہلو میں
خدا کا شکر کر ادا　　جوانی کے مزے اڑا
قصیدہ خواں وہ شاہ کے　　وہ نعرے واہ واہ کے
کہ سن کے وہ تڑپ اٹھا　　قرار و صبر کھو دیا
نظر گئی ہم نشیں سمت　　رخ قمر جبیں کی سمت
کبھی چل کے آہ کی　　فغاں ورد گاہ کی
بڑھا غرض جنون عشق　　نہ رک سکا فسون عشق
صنم کے نرم سینے پر

شکست خوردہ نیم جاں　　عظیم فاتح جہاں
جگا دے شہ کو نغمہ گر　　سنا نوائے تیز تر
مگر یہ کیا ہوا غضب　　یہ کس بلا کا ہے شغب
فضا میں برق کی چمک　　ہوا میں رعد کی کڑک
صدا میں بہت صور ہے　　کہ شورش نشور ہے
ذرا دیکھ مردے جاگے ہیں　　لحد سے اٹھ کے بھاگے ہیں
ٹموتھیس کا راگ اب　　لگا رہا ہے آگ اب
سکندر انتقام پر　　تلا ہوا ہے کس قدر
تمام بھوت اور پریت　　ہے قتل و خون جس کی ریت

تمام اژدرِ سیہ — جہاں کو کردیں گے تبہ
چہار سو چڑیل ہیں — قیامتوں کے کھیل ہیں
گریس کے الم نصیب — اجل رسیدہ غم نصیب
وہ بے لحد وہ بے کفن — لہو بھرے لب و دہن
وہ نامراد و تلخ کام — دلوں میں جوش انتقام
نظر میں جنگ کا جنوں — پکارتے ہیں خون خون
سکندر اٹھالے کے تیغ — پیئے قتال بے دریغ

پڑا وہ ٹرائے" کا سا "رن"
تیس بن گئی ہلن

ارشد صدیقی

ماتا کو پرنام

اے ماتا تجھ کو پرنام
تو چشموں سے مالا مال
باغ ترے کرنوں کے جال
مست ہوا ٹھنڈک برسائے
ہری بھری کھیتی لہرائے
تیری شکتی بڑی مہان
اے ماتا تجھ کو پرنام
چمکیلے سپنوں کی جیت
چشموں اور شاخوں کے گیت
تیرے پیڑوں کے پھل پھول
جیون من کے سکھ سنگیت
ہنستے میٹھے پیار کی چھاؤں
چوم لوں اے ماں تیرے پاؤں
اے شیریں اور نرم کلام اے ماتا تجھ کو پرنام

کون یہ کہتا ہے اے ماں؟
تیری دھرتی ہے کمزور
ہاتھوں میں لے کر تلوار
جاگے جب پینتیس۳۵ کروڑ
جب گرجے پینتیس۳۵ کروڑ
لے کر تیرا نام مہان
دیش کے کونے کونے میں
گونج اٹھی ان کی للکار
کتنے شکتی شالی لوگ
بل اور بدّھی سے بھرپور
کہتے ہیں تجھ کو بھگوان
تیرا ہے سب پر کلّیان
ہمیں بچا اور دے سمّان
ایک تجھی سے ہے فریاد
دشمن جس نے مار بھگائے
میدان اور سمندر پار
اور کیا خود کو آزاد
تو ہی عقل، تو ہی قانون
تو ہی من، جیون اور سانس

ہم کو تیرے پیار کی آس
تو من میں وہ بھاؤ جگائے
موت کو بھی جو مار بھگائے
تیرا ہی شکتی وردان
ہاتھ کو کرتا ہے بلوان
سندر موہن سکھ وشرام اے ماتا تجھ کو پرنام
تو چشموں سے مالا مال
باغ ترے کرنوں کے جال
اے رنگینی سے بھرپور
تو ساری قوموں کا میل
تیرے من میں موتی بیل
جیت بھری تیری مسکان
تو سب دیشوں کی پردھان
تیرے شکتی شالی ہاتھ
کرتے ہیں دھن کی بوچھار
اے ماتا تیرا وردان
کتنا سندر اور مہان
آزادی تیرا شبھ نام اے ماتا تجھ کو پرنام

عکس خیال ۱۹۵۷ء

نظم طباطبائی

یادِ رفتگاں

رو رو کے پکارا کریں گے رونے والے
بیدار کبھی نہیں یہ ہونے والے
تارے بھی ہیں آسماں کے ہم سے نزدیک
ہیں دُور بہت زمیں کے سونے والے

شاکر میرٹھی

یادِ وطن

ان شاندار محلوں کو کیا کروں میں لے کر
لگتا نہیں ہے میرا دل آہ! ان میں دم بھر
ان میں نہیں ہے میری دل بستگی کا منظر
دلکش کہیں ہے ان سے اجڑا ہوا مرا گھر
مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیارا
غربت میں مجھ کو رہنا دم بھر نہیں گوارا

ہیں برکتیں اترتیں جس گھر میں آسماں سے
پیارا ہے آہ! وہ گھر میرے لئے جہاں سے
اے گھر نوا ہے دلکش تو روضۂ جناں سے
ہاں! تو عزیز تر ہے مجھ کو ہزار جاں سے
مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیارا
غربت میں مجھ کو دم بھر رہنا نہیں گوارا

آوارۂ وطن ہوں گم کردہ خانماں ہوں
صحرا میں مدّتوں سے ہیں گرد کارواں ہوں

رو رو کے آہ اکرتا مثل جرس فغاں ہوں
غربت میں میں رگڑتا برسوں سے ایڑیاں ہوں

مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیار
غُربت میں مجھ کو رہنا دم بھر نہیں گوارا

ننھا چھوٹی چڑیوں کو میں جہاں بُلاتا
اور گیت ننھا خوشی کے مقدم میں ان کے گاتا

وہ گھر میں تھیں چہکتیں، میں گھر میں گنگناتا
تانیں سُناتی تھیں وہ، میں لوریاں سُناتا

مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیارا
غربت میں مجھ کو رہنا دم بھر نہیں گوارا

"زمانہ" کانپور ستمبر ۱۹۱۰ء

خادم کنتوری

آدمی

کہتے ہیں اگلے وقتوں میں تھا ایک آدمی
لیکن وہ کیا تھا کون تھا اس کی خبر نہیں

پر جس طرح ہیں ہم ہیں بد و نیک آدمی
باتیں سب اس کی ایسوں ہی سے ملتی جلتی تھیں

مولد ہی سے تھی اس کے کسی کو نہ آگہی
مدفن ہی کا نہ اس کے جہاں میں ہے کچھ پتا

معلوم ہے پر اتنی حقیقت رہی سہی
اس کا نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا

یہ جانتے ہیں ہم کہ مسرت بھی رنج بھی
رہتے تھے اس کے قلب میں بیم و رجا کیا تھ

پر راحت و مصیبت و عیش و ملال کی
کیا ملو خبر مٹے وہ ہوائے فنا کے ساتھ

اعضاء بھی نبض بھی حرکت میں ہیں روز و شب
محسوس ہوتے ہیں جذبات دلی تمام
بے شبہ حالتیں یہی گذری تھیں اس پہ سب
یہ کیفیت ہر ایک بشر کے لئے ہے عام
تکلیف اٹھائی اس نے پہ وہ دن گذر گئے
آرام پایا، پر وہ زمانہ نہیں رہا
احباب بھی تھے اس کے مگر وہ سب مر گئے
جو مدعی تھے ان کا ٹھکانا نہیں رہا
عاشق تھا وہ پہ کس کا؟ کسی کو خبر نہیں
جز مرگ و قبر کون ہے اب اس کا رازدار
معشوق اس کا مان بھی لیں گر کہ تھا حسین
پر اس کا حُسن کر نہ سکا رد قضا کا وار
وہ دیکھتا تھا سب یہی جو دیکھتے ہیں ہم
ان ساری زحمتوں کا تھا اس کو بھی سامنا
جو کچھ ہیں ہم یہی تھا وہ اس سے سوا نہ کم
اب اس کو پیش ہے جو ہمیں پیش آنے گا
یہ گردشیں زمانہ کی یہ روز اور یہ شب
یہ مہر و ماہ و کوکب و کوہ و بحار و ارض
لطف ان کا تھا جبھی کہ بدن میں تھی روح جب
پھر روح پر رفاقت تن کب رہا تھی فرض

یہ دھوپ اور یہ چاندنی یہ ابراذری
پہونچاتے تھے جو روح کو اس کی مسرتیں

بھولے سب ایسے یہ بھی نہیں پوچھتا کوئی
کیا اس کو پیش آئیں لحد میں مصیبتیں

صفحات کارنامۂ اولاد بوالبشر
دیکھے بہت پر ان میں نہ تھی بات کچھ نئی

کہتے ہیں یک زبان بھی قصروں کے یہ کھنڈر
رہتا تھا اگلے وقتوں میں یہاں کوئی آدمی

ارمغان فرنگ ۱۹۰۱ء

عرشی زادہ

فریب کی دیوی

مجھے بتا کہ یہ کیا ہو گیا ہے حال ترا؟
کنارِ آب، یہ خاموشیاں یہ تنہائی
نظر جھکائے ہوئے دل میں غم چھپائے ہوئے
کہاں گئے وہ ترے شوخ عارضوں کے گلاب
کہ جن کی زد پہ ہزاروں چمن تھے آئے ہوئے
بھٹک رہا ہے کدھر ان دنوں خیال ترا؟

تری جبین عرق آلود ہے پریشان ہے
اگرچہ سرد بھی ہے یخ زدہ بھی ہے موسم
اگرچہ نم ہیں ہوائیں، مگر ترا عالم!
بتا بتا نہ بتا اک نشانِ طوفاں ہے

سنہرے گیہوں کی بالوں کو کھیت سے چُن کر
گلہریوں نے گھروندے سجا لئے اپنے
کسان جا بھی چکے لوٹ کر زمیں کا شباب
قرار پا گئے ہر دل کے خوش نما سپنے
یہ دن کے بلبلیں خاموش ہیں مگر پھر بھی
دیہ دن کے سبزۂ بے گانہ برف کے اندر
چھپا ہے جو رو ستم سے خزاں کے گھبرا کر
یہ دن کے کوئی نہیں تیرا چارہ گر پھر بھی
ترا گزر ہے یہاں کس کی آرزو میں بتا؟
ترا سفر ہے ادھر کس کی جستجو میں بتا؟

یہیں یہیں اسی وادی میں ایک دن میں نے
سکونِ قلب و نظر کی لگائی تھی بازی
یہیں یہیں کسی چشم سیہ کی مستی سے
ہوئی تھی مجھ پہ بھی لطف و کرم کی فیاضی

ملی تھی مجھ کو مری زر نگار شہزادی
ہزار عشوۂ جانانہ آزماتے ہوئے
خرام ناز پہ رنگینیاں نچھاور تھیں
بلا رہی تھی مجھے میرے پاس آتے ہوئے

وہ اس کے شانوں پہ بکھرے ہوئے مہک گیسو
کہ جن کے رقص سے طرزِ خرام پائی تھی۔
کہ جن سے موجِ صبا کھیل کھیل جاتی تھی
حسین خموں کو بناؤ نئے سکھاتی تھی
کہ جن سے روحِ چمن مستیاں چراتی تھی
مہک رہے تھے ہر اک گام نافۂ آہو

بڑھا میں ہدیۂ جان و دل و جگر لے کر
چھُپایا پھُولوں کے اندر سجا کے ہاروں میں
خموشیوں میں ہزاروں پیام پنہاں تھے
پہن کے ہار بتایا گیا اشاروں میں
مجھے تلاش تھی تیری طلب بھی تھی تیری
میں اب بھی تیری ہوں اور جب بھی تھی تیری

ہوئی شریکِ سفر کچھ لجاتے، شرمائے
لبوں پہ اپنے کوئی اجنبی ترانہ لئے
جوان دن کا جواں رات کا فسانہ لئے
چلا میں رخشِ سبک سیر پر بٹھا کے اسے

ابھی تلک ہیں مجھے یاد وہ حسیں لمحات
بتا رہی تھی مجھے راستہ شبستان کا
میں اس کے روپ میں کھویا ہوا تھا حیراں تھا
کہ مجھ سے دُور تھے دُنیا کے تلخ احساسات

سرور و کیف سے مدہوش جب شبستاں میں
پہنچ گئے تو اٹھائے نشاط کے ساغر
ہر ایک چپہ سمن زار بن گیا گویا
جنوں و حسن ملے جب گلے یہاں آکر

وہ خود ہی رونے لگی دیکھ دیکھ کر مجھ کو
کنول کے پھولوں سے جیسے ڈھلک پڑے شبنم
نشے میں چوم لئے میں نے نرگس بیمار
لبوں پر ثبت کئے میں نے بوسہ پیہم
اسیرِ زلف ہوا منزل طرب پائی
حسین چاند ملا اک حسین شب پائی

کچھ ایسی رُت تھی کچھ ایسی فضا تھی، ایسا سماں
چلا گئی مری آنکھوں پہ نین کا جادو

جب اس نے چھیڑا مرے دل کے ساز پر نغمہ
بدل گئی مری دُنیا کی ہر خوشی پہلو
یہ ظلم اس نے کیا مجھ پہ مہرباں ہو کر
گرا میں خواب کے غاروں میں نیم جاں ہو کر

یہ کیا بتاؤں کہ کیسی تھی خواب کی دُنیا؟
یہاں تھے قید کئی شاہ اور شہزادے
بدن کے ڈھانچ کھنڈر اور رستے پتھر کے
مجھے جو دیکھا تو بولے فریب کی دیوی
تجھے بھی اپنے طلسم وفا میں لے آئی
ہمیں بھی ہجر کا رونا ہے وصل کی اُمید
بساطِ ذہن پہ چھایا ہے ذوق گفت و شنید
سمجھ سکا نہ کسی طرح حسن و عشق کا راز
بس ایک میں تھا اور اندیشہ ہائے دور و دراز
مرے لئے تھی بڑے اضطراب کی دُنیا

پھر اس کے بعد کھلی آنکھ کچھ نہیں معلوم
کہاں گیا وہ زمانہ وہ عہد خوش آئین

کہاں وہ مہر و محبت کی رازدار گئی
مجھے بنا کے گذشتہ عنایتوں کا امیں
سکون چھین لیا بے قرار چھوڑ گئی
بہار لے گئی یاد بہار چھوڑ گئی

کنارِ آب یہ تنہائیاں یہ خاموشی
نظر جھکائے ہوئے دل میں غم چھپائے ہوئے
نہ جانے کیسے کٹے زندگی خدا معلوم
بھٹک رہا ہوں امیدوں سے لو لگائے ہوئے

آج کل اکتوبر ۱۹۶۵ء
(شاعر ندیم کے قلمی نام سے)

ہمنر جمہ حصہ اول صفحہ ۲۳۳ پر دیکھئے۔

محمد عباس کاظمی نیشاپوری

دلربا

حسن کا اس کے شہرہ سنا تھا
دل مرا مبتلا ہوچکا تھا
صبح کے وقت رستے میں اک دن
ہوگیا اس کا دیدار ممکن
دوست کوئی نہ غم خوار کوئی
جارہی تھی کہیں وہ اکیلی
سبزہ وگل جہاں میں کھلیں گے
خوبرو اور حسیں بھی ملیں گے
حسن کا دلربا ایسا نقشہ
کلک قدرت نے لیکن نہ کھینچا
بس اسی دن کا یہ واقعہ ہے
کم زمانے میں ایسا ہوا ہے

شام کے وقت نکلی قضارا
آ کے طوفان نے اس کو گھیرا

چار جانب سے چھایا اندھیرا
پھنس گئی کس بلا میں وہ تنہا

لاکھ ڈھونڈے بچت کے بہانے
پر نہ چلنے دیا کچھ قضا نے

ٹوٹی کشتی جدا نا خدا تھا
برف اور برق کا سامنا تھا

فرق آیا نہ آزادیوں میں
کھو گئی برف کی وادیوں میں

رات بھر ماں نے اس کو پکارا
تھی وہی زندگی کا سہارا

صبح کے وقت پھر دیکھا جا کے
برف پر اس کے نقش قدم تھے

جسم و جاں میں ہوئی تھی جدائی
غرق حسرت تھی غم کی ستائی

دلربا ایسی جب چھوٹ جائے
کیوں نہ پھر کس کا دل ٹوٹ جائے

بہارانگستان سرفراز قومی پریس ۱۹۷۰

فضل الرحمٰن

زندہ جاوید شاعر

کرب و طرب کے شاعرو ارض و سما کے طائرو
کیا یہ زمین و آسماں دونوں تمہارے ہیں مکاں؟
اب تو سحر کے ساتھ ہو شمس و قمر کے ساتھ ہو
چشمۂ خور کے ہم زباں بجلیوں کے مزاج داں
سبزہ جہاں قدم قدم زینت گلشن ارم
چاندنی جس جگہ سدا لُطف دکھائے نت نیا
لالہ و گل کے سائے میں رنگوں کی سرائے میں
نکہتیں خُلد کی جہاں عطر پئے مشام جاں
جس جگہ عندلیب بھی نکتہ طراز فلسفی
گاتی ہے فرط شوق سے کون و مکاں کے زمزمے
جائیں تمہاری عرش پر تانیں زمیں کے فرش پر
روئے زمیں کے یہ سفیر نسل بشر کے دستگیر

روحیں یہ خلد ارض کی — عقدہ کشائے زندگی
فکر کو راہ دکھاتی ہیں — سوئے فلک اڑاتی ہیں
ہم کو یہ زندہ شاہکار — دیتے ہیں درس روزگار
زندگی کے یہ قصہ خواں — عیش و الم کے نغمہ خواں
آئینہ دار بزم یہ — جادو بیان رزم یہ
راز شکست و فتح کا — ہم کو بتاتے ہیں صدا
کرب و طرب کے شاعرو — ارض و سما کے طائرو

ہاں یہ زمین و آسماں
دونوں تمہارے ہیں مکاں

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

نغمۂ زندگی

غمزدہ ہو کر نہ یہ کہنا کبھی
"خواب سے بڑھ کر نہیں کچھ زندگی"

خواب میں ہر شے کا ہے فرضی وجود
حاشا! کہ ایسی نہیں یہ ہست و بود

ہاں نہ سمجھنا اسے وہم و خیال
وہم بھی ہوتا ہے کہیں لازوال

اگلی دنیا میں یہی ہے جھلک
اور نہیں اس کی لب گور تک

خاک میں ہوتا ہے بدن پائمال
روح فنا ہو یہ نہیں ہے مجال

رنج سے مطلب نہ خوشی سے ہے کام
کام سے ہے کام یہاں پر مدام

کام میں مشغول ہیں جو ہر گھڑی
روز وہ طے کرتے ہیں منزل نئی

آج کا رکھتے نہیں کل پر جو کام
اُن کا یہاں آج تو کل واں مقام

علم کی منزل ہے بڑی اور کڑی
وقت رواں اور دواں ہر گھڑی

دل ہیں توانا وہ دلیر و جواں
خوف سے لرزاں ہیں مگر ہر زماں

دیکھئے کس طرح یہ منزل ہو طے
بس یہی دُبدا ہے یہی خوف ہے

دُنیا دیکھو تو ہے میدان جنگ
دوڑیئے اس میں تو نہیں ہے یہ تنگ

فوج پہ فوج آتی ہے اس میں چلی
زندگی اب ڈالتی ہے کھلبلی

برف کے تودے ہیں مگر جا بجا
سن سن چلتی ہے برابر ہوا

ابر سے مطلع پہ ہے کچھ تیرگی
آگ ہے ہر خیمہ کے اندر بجھی

فوج جو غافل ہے پڑی سو رہی
سر پر اس کے ہے قضا کھیلتی

جس کی تلوار نے چھوڑا نیام
اس کا ہے میدان سے آگے مقام

گھوڑا جس کا ہے ذرا سُست پا
اس کے پس جانے میں کیا دیر ہے

مرد بنو مرد کہ بن جائے کام
کام کرو کام کہ رہ جائے نام

محنت کا جھیلنا شیوا کرو
میوا کھانا ہے تو سیوا کرو

رکھو نہ آئندہ زمانہ سے کام
گرچہ امیدوں سے بھرا ہو تمام

اگلے زمانے کو بھی تم جاؤ بھول
مردہ لاشوں کا جگانا فضول

زندہ اگر ہے تو یہی حال ہے
پنہاں اسی حال میں اقبال ہے

محنت پر جس کی بندھی ہے کمر
ہر دم جس کی ہے خدا پر نظر

کام میں رہتا نہیں ناکام وہ
رکھتا تقدیر کو ہے رام وہ

کام میں رہتے تھے جو ہر وقت چور
جن کے دم سے ہے یہ سارا ظہور

زندگی ان کی یہ بتاتی ہے راز
غفلت و آرام سے باز آؤ باز

کام میں کھل جاؤ نہ گھبراؤ تم
زندہ جو رہنا ہے تو مر جاؤ تم

نام انہی کا ہے جہاں میں بلند
آگ پہ جلتے تھے جو ہو کر سپند

دل پہ اٹھاتے تھے جو محنت کے داغ
رکھ گئے ایک ایک قدم پر چراغ

اٹھو اٹھو قدم آگے بڑھاؤ
منزل کھوٹی نہ ہو اب جیت جاؤ

وقت کے میدان میں کر کے آؤ جاؤ
ریت پہ کچھ نقش قدم چھوڑ جاؤ

سامنے دیکھو ہے سمندر میں جوش
ہر دم طوفان سے ہے اٹھتا خروش

ایک جہاز آ کے بھنور میں گرا
تند ہوا لے گئی تختے بہا

آتے ہیں یا بہتے ہوئے تختے ادھر
اترے ہیں ساحل پہ کچھ انساں مگر

ہوش میں آ کر جو یہ ڈھونڈیں گے راہ
نقش قدم ہوں گے تمہارے گواہ

دیکھ کے اس ریت پہ نقش قدم
ہوں گے یہ طوفاں زدہ اب تازہ دم

کام سے جن کے ہے یہ سب رنگ و روپ
کرتے ہی رہتے ہیں سدا دوڑ دھوپ

ایک منٹ کے لئے تھم جائیں گر
قافلہ دنیا کا ہو زیر و زبر

غول کے مانند ہیں وہ تیز گام
خضر کا پر زندہ انھیں سے ہے نام

چھیلتے دنیا میں کڑی ہیں یہی
کوکتے دنیا کی گھڑی ہیں یہی

وہ جو کریں کام تو پھر کیا نہ ہو
وہ نہ ہوں دنیا میں تو دنیا نہ ہو

ان کے ہی دم سے ہے یہ ہلچل مچی
ان کے ہی سایہ سے ہے یہ روشنی
ان کی بدولت ہیں یہ نقش و نگار
ان کے قدم سے ہے یہ ساری بہار
باندھ لو ہمت کی کمر تم بھی چست
عزم ہو بالجزم تو نیت درست
دل کی امنگوں کو نہ ہرگز دباؤ
چاہو میداں میں جدھر دوڑ جاؤ
کام کرو نام خدا ہو جہاں
کام سے رہتا ہے سدا نام یاں
وقت پہ ہر کام کو کرتے رہو
کام پہ اور نام پہ مرتے رہو
شکووں کی حد سے بڑھا دو فرس
قسمت منہ دیکھتی رہ جائے بس
رنج و مصیبت سے رہو کھیلتے
کڑیاں قسمت کی رہو جھیلتے
وقت کا اور فرض کا رکھو خیال
کام میں ناکام ہو تم کیا مجال

آخری بندہ کی یہی عرض ہے
فرض کو پورا کرو یہ فرض ہے

دولت دنیا ہے اسی سے عیاں
راحت عقبیٰ ہے اسی میں نہاں

جب نہ رہا قوم میں باقی یہ جوش
ہوگئیں سب قوتیں اس کی خموش

دین کی گرمی ہے نہ دنیا کا اوج
پھر گئی یارو یہ تباہی کی موج

کاش ہو وہ ولولہ پھر موجزن
جس نے قبائل کو کیا انجمن

جس نے ہر ایک فرد کو گرما دیا
ذرہ و خورشید کو لڑوا دیا

جس نے کیا علم کا پرچم بلند
جس نے کیا چشمہ تعصب کا بند

جس نے کیا فتح کا دریا رواں
جس نے کہ تہذیب کا باندھا سماں

جس نے کہ رگ میں وہ جادو بھرا
جس سے کہ چونچا تھا چھوٹا بڑا

کام میں مشغول تھے سب صبح وشام
فرض پہ مرتا تھا ہر ایک خاص وعام
کام میں رہتی تھی سدا بیکلی
پیرو وجواں کی تھی یہی زندگی
علم وعمل کا تھا ہر اک جا ظہور
پھیل گیا صبح تمدن کا نور
کاش وہی صبح ہو پھر جلوہ گر
قوم میں جنبش ہو وہی سربسر
زندہ دلی کا وہی پیدا ہو جوش
بزم میں برپا ہو وہی ناؤنوش
پھر وہی آجائے مرقع نظر
جس میں ہر اک صورت تھی پر اثر
پھر اسی امت کا ہو مجمع بہم
جس کا لقب تھا کبھی خیرالامم
چپ ہو اے دل کہ تیری آرزو
سننے نہ پائے فلک کینہ جو

ہمترجمے حصہ اول صفحات ۵۴ و ۵۵ حصہ دوم صفحہ ۱۲۸ حصہ سوم صفحات ۶۵، ۶۸ و ۱۲۸ اور حصہ چہارم صفحہ ۵۸ پر دیکھیے۔

شاکر میرٹھی

میں کیوں زندہ ہوں

منظر ہیں گو جہاں کے نیرنگ خواب عبرت
اور ہستی بشر ہے تصویر بزم حیرت
یہ میں بھی جانتا ہوں، مجھ کو بقا نہیں ہے
سایہ ہے زندگی کا تمثال بے حقیقت
زندہ مگر ہوں اپنے احباب کے لئے میں
مجھ کو ہزار جاں سے کرتے ہیں جو محبت
جینے کا ہیں سہارا یاران زندہ دل وہ
ہیں جن کے قلب صافی آئینۂ صداقت
اوپر جو آسماں ہے یہ مُسکرانے والا
ہے انبساط افزا جس کی بہار قدرت
جو میری رُوح کا ہے حسرت کش تمنّا
ہے میری زندگی بھی سرچشمۂ محبت

مجھ کو ہوس نہیں ہے ہستی بے بقا کی
اتنی مگر عطا کر اے مرگ! مجھ کو مہلت

دُنیا میں رہ کے زندہ وہ نیک کام کرلوں
مجھ ناتواں میں جن کی تکمیل کی ہے طاقت

ہاں! میری زندگی کی اور خوشنما امیدو
آرام جانِ مضطر، سرمایۂ مسرت

بچھڑی ہوئی ہو مجھ سے گرچہ رہ طلب میں
تلخی میں بھی ہے تم سے جینے کی اک حلاوت

دُنیا کا سلسلہ ہے زنجیر شوق مجھ کو
اے اہلِ دہر ہوں میں پابند دام الفت

میں وہ بقا طلب ہوں اے مرگ ناگہانی
زندہ ہوں آہ! ان کی سننے کو میں کہانی

میرے لئے جو بن کر آما جگاہ ہستی
کھایا کئے ہیں دل پر تیر غم نہانی

میں تاکہ نقش پا کو ان کے بنا کے رہبر
شہرت کی چھوڑ جاؤں اپنی یہاں نشانی

وہ شاعرانِ کامل اور وہ ادیب فاضل
رہ جیں فضا میں جن کی ہیں محو خوش بیانی

وہ کشتگان قومی، چھینٹوں سے جنکے خوں کے
تاریخ دہر کے ہیں اوراق ارغوانی
وہ جاں نثار قومی اور وہ وطن کے شیدا
غم میں ہے وقت جن کے سرگرم نوحہ خوانی
پڑھنے کو ہوں میں زندہ ان کی حکایتوں کو
ہمت فزا ہے جن کی تمثیل زندگانی
آئے گا دیکھے کب وہ امن کا زمانہ
گائیں گے جب محبت کامل کے سب ترانہ
لڑیوں میں سیم وزر کی بن کر نجوم دانش
عقل و خرد کے چمکیں گے جب دیگانہ
جب شورشیں نہ ہوں گی یاروں کی انجمن میں
لب پر برائیوں کا ہوگا نہ جب فسانہ
جب نیکیوں کی کرنیں چمکیں گی آسماں پر
باغ عدن کا ہوگی دُنیا نگار خانہ
زندہ عبث نہیں ہوں اے مرگ ناگہاں میں
پھرتا ہوں جستجو میں اس کی کشاں کشاں میں
مردانہ کر رہا ہوں طے منزل حقیقت
ہوں جادۂ طلب میں یعنی رواں دواں میں

میں اور بزم دنیا، اے ساکنان ہستی
شاید ہوں میں ازل کا خلوت میں رازداں ہیں
زحمت ہے مجھ کو رحمت کیوں کر کہوں زباں سے
ہوں اس الم کدے میں منت کش فغاں میں
دامن میں پھول چننے کو صدق و راستی کے
ہوں اس چمن میں محو گلگشت گلستاں میں
ہیں میری زندگی کے اعلیٰ وہ کیا مقاصد
سرگرم جستجو ہوں، اے عقل نکتہ داں میں
منظر ہیں گو جہاں کے نیرنگ خواب عبرت
اور ہستی بشر ہے تصویر بزمِ حیرت
میں جانتا ہوں اس میں مجھ کو بقا نہیں ہے
سایہ ہے زندگی کا تمثال بے حقیقت
زندہ مگر ہوں اپنے احباب کے لئے میں
مجھ کو ہزار جاں سے کرتے ہیں جو محبت
جینے کا ہیں سہارا یاران زندہ دل وہ
ہے آہ! نقش جن کے دل پر مری صداقت
اوپر جو آسماں ہے یہ مسکرانے والا
ہے انبساط افزا جس کی بہار قدرت

جو میری روح کا ہے حسرت کش تمنا
ہے میری زندگی کا سرچشمہ محبت

مجھ کو ہوس نہیں ہے ہستی بے بقا کی
اتنی مگر عطا کر اے مرگ! مجھ کو مہلت

تسخیر آہ! کر لوں میں ان برائیوں کو
جن کے مقابلے کو نیکی کی ہے ضرورت

اور کاش! ختم کر لوں میں وہ اہم مقاصد
تکمیل کو ہے جن کی واجب مری اطاعت

جلوہ ترا کہاں ہے؟ اے روزگار فردا
ہوں بزم آرزو میں مشتاق دید صورت

سب کام پورے کر کے خوش خوش جہاں سے جاؤں
ہو وقت نزع یارب! دل میں نہ کوئی حسرت

"زمانہ" کانپور اگست دسمبر ۱۹۰۹ء

ایک لڑکی سے شاعر کا خطاب

مری پیاری چھوٹی بچی
مرے پاس گیت کوئی
نہیں ایسا جو سُناؤں
کہ زمیں سے آسماں تک
یہ اُداسی چھا رہی ہے
کہ طیور نغمہ خواں بھی
ہیں خموش مری پیاری
مگر آہ اس سے پہلے
کہ جُدا ہوں آج تم سے
تمہیں دوں گا اک سبق میں
جو تمہارے کام آوے
بنو تم جہاں میں اچھی
ہے یہی مری نصیحت
جو یہ بات چاہتے ہیں
بنیں ہوشیار و پرفن
کرو ان کی کچھ نہ پروا
تمہیں سادگی مُبارک!
کرو کام اچھے اچھے
نہ خیالی باتوں میں تم
یونہی سارا دن گنوا دو

اور اسی طرح اگر تم رہیں نیک اس جہاں میں
تو یہ زندگی تمہاری
کبھی موت بھی جو آئے تو بقا کو ساتھ لائے
یہی نغمہ ہو تمہارا
تمہیں جس کی آرزو ہے

محی الدین

پانی کے ننھے قطرے

پانی کے ننھے قطرے مٹی کے چھوٹے ذرّے
ہیں ندیاں بہاتے فرشِ زمیں بچھاتے

یہ مختصر سی گھڑیاں ظاہر ہیں کچھ نہیں گو
دورِ ابد ہیں لیکن اِن سے ظہور پاتے

یونہی ذرا ذرا سی یہ غلطیاں ہماری
ہیں روح کو ہٹاتی نیکی کے راستے سے

احساں کرم مروّت اُلفت کے بول میٹھے
مثلِ بہشت شاداں دنیا کو ہیں بنائے

ارشد صدیقی

موجودہ لمحہ

اٹھ کہ اب دن بھی گزرنے کے قریب آپہنچا
اور پڑا سوتا ہے تو خوابِ گراں میں اب تک
دوسروں نے تو زرہ کس کے کمر باندھ بھی لی
اور آگے گئے میداں کی طرف لڑنے کو
منتظر ہے تیری آمد کا مگر تیرا مقام
کچھ نہ کچھ کام تو ہر مرد کو کرنا ہو گا
آج "مستقبل" و "ماضی" کی حقیقت کیا ہے؟
آج تو "حال" کی سنجیدگی کام آئے گی

اٹھ بھلا دے نگہہ و ذہن سے خواب آئندا!
یعنی اک سخت مہم کر کے تو میداں لے گا

کہیں ہوتے ہیں ہواؤں پہ بھی قلعے تعمیر؟
دیو پیکر سے کہیں دوڑ میں کی جاتی ہے شرط؟
تجھ کو آیندہ فتوحات بھی سر کرنی ہیں
اور عزّت بھی خدا چاہے تو چومے گی قدم
تیرے بازو کبھی مضبوط نہ ہوں گے لیکن
اہمیّت "آج" بھی تجھ کو نہ اگر آئی نظر

اٹھ اگر روک رہا ہے تجھے تیرا ماضی!
اس کے ہر درد و مسرّت کو بھلا دے دل سے
تجھ کو پچھتاوے نے بیکار جکڑ رکھا ہے
کوئی زنجیر بھی اس درجہ سبکسار نہیں
ماضی غمگین و درخشاں ہی مردہ ہی تو ہے
اس کی تخئیل کے ہتھیاروں کو اب پھینک بھی دے
اپنے ماضی کی طرف ایسے تو مڑ مڑ کے نہ دیکھ
آج کے جہد و عمل کے لئے جینا ہے تجھے

اٹھ کہ اب دن بھی گذرنے کے قریب آپہنچا
اور یہ آواز جو مشکل سے تو سن سکتا ہے

فوج اِعدا ہی کے قدموں کی تو آواز ہے یہ
اٹھ ذرا دیکھ وہ دشمن بھی قریب آپہنچا

دھار ہتھیاروں پہ کرنے کا بھی اب وقت نہیں
ورنہ یہ لمحہ بھی آخر کو گزر جائے گا

اور جب چونکے گا آیندہ کی اس جنگ سے تو
تجھ کو یہ لمحہ بھی ماضی ہی نظر آئے گا

فضلُ الرحمن

شکسپیر

جانتے ہیں ہم انھیں جتنے نواپرداز ہیں
شخصیت پر تیری لیکن پردہائے راز ہیں

اک تبسم ہے ہمارے سو سوالوں کا جواب
اس بلندی سے کہ عنقا بھی نہ دیکھے جسکا خواب

چومتے ہیں چرخ کو جس طرح کہسار بریں
جنکی آنکھوں کے ہیں تارے ماہ و خورشید مبیں

ہیں قدم جن کے زمیں پر جنکے سر افلاک پر
جن کا قبضہ اوجِ گردوں کی فضائے پاک پر

جنکے آگے نارسائی سے ہے وماندہ بشر
جنکے دامن کے سوا آتا نہیں کچھ بھی نظر

مہر و مہ سے تیری نظریں بھی یونہی لڑتی رہیں
وہ نگاہیں جو جہانِ نور پر پڑتی رہیں

تھی خود آگہ تیری حکمت تجھ کو خود پر اعتماد
خود سے سیکھا علم تو نے پائی خود سے تو نے داد

تھے ترے ہم عصر تجھ سے ترے نا آشنا
نابلد تاثیر سے نغموں کی تیرے ہم نوا

تیرے لافانی سخن میں درد انسانی جھلک
چہرۂ فاتح میں کرب روح دورانی جھلک

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

ساحرؔ

محبّت اور موت

ردائے نُور پھیلائے فلک پر ماہ انور تھا
وفورِ انبساط و نور سے پر نور منظر تھا

یکایک انتہائے نور پاشی کو زوال آیا
قمر کو پردۂ روشن اٹھانے کا خیال آیا

محبّت گلشنِ جنت کے گوشے سے نکل آئی
نگاہِ شوق بیتابی سے چاروں سمت دوڑائی

تو پایا سیر کرتے "موت" کو اشجار کے نیچے
نہ جانے کیا وہ باتیں کر رہی تھی اپنے ہی دل سے

اِدھر جب موت نے دیکھا "محبت" کو تو یوں ڈپٹا
یہاں میرا تسلّط اور بستی ہے آ کے تو کانٹا

"محبت" نے پرِ پرواز پھر روتے ہوئے تولے
اور اپنی ہچکیوں کو روک کر لب اسطرح کھولے

مجھے معلوم ہے بے شک یہاں تیری حکومت ہے
مگر یہ بھی بتا دوں تجھ سے نام میرا بھی محبت ہے

حقیقت سے میں واقف ہوں تری تو چیز ہی کیا ہے
تو نخلِ زندگانی کا فقط سایا ہی سایا ہے

شجر جب تک کھڑا ہے آسماں کی چھاؤں کے نیچے
تو سایہ بھی پڑا رہتا ہے اس کے پاؤں کے نیچے

مگر جوں ہی شجر گھڑا کہ سایہ بھی ہوا معدوم
اسی صورت تری ہستی بھی ہے اک ہستیِ موہوم

وجودِ ہستیِ نوعِ بشر سے ہو گیا پیدا
فضائے زندگانی میں ازل سے "موت" کا سایا

تری ہستی بھی بس قائم وجودِ زندگی تک ہے
ترا دورِ حکومت بھی نمودِ زندگی تک ہے

ترا بھی کوچ ہو گا زندگی نابود ہونے پر
مٹے گی تو حیاتِ جاوداں موجود ہونے پر

یہ تیرا مختصر عہدِ حکومت تا بہ کے آخر؟
یہاں بعدِ فنا میرا تسلط ہی تو ہے آخر

مرا ہر روح پر قبضہ ہمیشہ کے لئے ہو گا
ہر اک دل میرے ہی جامِ محبت کو پئے گا

نیرنگ دہلی جون ۱۹۳۲ء

اوج گیاوی

زندگی

اے بہارِ زندگی اے مایہ عیش و نشاط
تیرے ہی دم سے ہیں وابستہ یہ سارے انبساط
کتنا خوش آئند ہے اے زندگی منظر ترا
کتنی دلکش آہ ہے تیری بہارِ جانفزا

حیف باغ زندگی تجھ میں نہیں رنگِ ثبات
ایک جھونکے میں تری مٹ جائیگی کل کائنات
چند روزہ ہے یہ تیری خوبی حُسنِ شباب
یہ بہار روح افزا آہ ہے مثل حباب

اے مری روح رواں اے مری پیاری زندگی
رہ نہیں سکتی ہمیشہ گرم بازاری تری
برق کے مانند ہے اس دہر میں تیرا ثبات
ایک لمحہ میں تری معدوم ہے سب کائنات

تو شگفتہ پھول کے مانند ہے اے زندگی
صدمہ بادِ خزاں سے ایک دن مٹ جائیگی
دیکھتے ہیں چشمِ عبرت سے تجھے اہلِ نظر
تجھ سے لیتے ہیں فنا کا ہم سبق شام و سحر

بے وفا ہے کچھ نہیں تیرا بھروسا زندگی
گلشن ہستی سے تو اک دن فنا ہو جائیگی
پھر نہیں باقی رہے گا بوئے اُلفت کا نشاں
نیست ہو جائے گا گلزار محبت کا نشاں

چشمِ عبرت سے ہمیشہ دیکھ تو حال بشر
زندگی کا بھی بھروسہ کچھ نہیں اے بے خبر
ہیں نہایت پر خطر دنیا میں راحت کے مزے
زہرِ قاتل سے نہیں کم جامِ عشرت کے مزے

یہ سُراب زندگی ہے اس کی اُلفت کچھ نہیں
ظاہری ہے اس کی آرائش یہ زینت کچھ نہیں
زندگی انسان کی اک ہستی موہوم ہے
یہ نشاط و عیش دُنیا غافلو معدوم ہے

"زمانہ" کانپور نومبر ۱۹۰۹ء

نوبت رائے نظرؔ لکھنوی

صلائے عام

ہوشیار اے مردِ غافل خوابِ غفلت کب تلک
وقت جاتا ہے قیام اس کو نہیں زیرِ فلک
ہو چکے اغیار اپنے کیل کانٹے سے درست
سج چکے ہتھیار بہرِ جنگ ہیں چالاک و چُست
پیش قدمی کر چکے ہیں سوئے میدانِ دِغا
ان کی سرگرمی ہے گویا پیش خیمہ فتح کا
کچھ نہ کچھ دکھلائیں گے سب جوہرِ مردانگی
لے چکے ہیں عقل و ہمت سے یہ سب پروانگی
اک جگہ خالی ہے تیری بھی صفوفِ جنگ میں
اٹھ کے جلدی چل، پڑا ہے بے خبر کس رنگ میں
آج جو ہے کل نہ ہوگا کل جو تھا وہ اب کہاں
حال ہے ماضی و مستقبل پہ فائق بے گماں

ہیں گذشتہ اور آئندہ زمانے مثل خواب
ان کی ہستی ہے جہاں میں صورت موج سراب
امتحانِ سخت اک درپیش تجھ کو آج ہے
کل نہ یہ موقع ملے گا، مل گیا جو آج ہے

خواب آئندہ زمانے کے نہ دیکھ اٹھ اے جواں
معرکہ اک سخت سر کرنا ہے تجھ کو بے گماں
اک طلسمی قلعہ پر کرنا ہے دھاوا آج ہی
اک دیو کوہ پیکر سے ہے لڑنا آج ہی
اک حماقت ہے یہ کہنا وقت ابھی آیا نہیں
وقت ہے موجود ہردم وہ کہیں جاتا نہیں
کہ گیا ہے ہم سے پہلے خوب اک ناکام عشق
آج ہی ہو جائے ہونا ہو جو کل انجام عشق
اس کی ہمّت دیکھ اس کی بے قراری دیکھ تو
اور بہر مطلب دل جاں نثاری دیکھ تو
ہیں بہت سے کام آئندہ زمانے کے لئے
عزت و توقیر ہم چشموں میں پانے کے لئے
ہوں وہ سب پورے کہیں جلدی خدا وہ دن دکھائے
لیکن ان سے پیشتر کا کام بھی انجام پائے

پہلے یہ میدان سر کرلے کہ طاقت ہے ابھی
اور نہ لاحق ہوگی پھر جیسی ضرورت ہے ابھی

چونک خوابِ ناز سے دل میں نہ لا کچھ پیش وپس
قافلہ تیار ہے آتی ہے آوازِ جرس
اٹھ اگرچہ تجھ کو مانع ہوں گذشتہ واقعات
رہ گیا ہے زن نہایت کم چلی آتی ہے رات
ہوچکا ہونا تھا جو کچھ اس کا اب افسوس کیا
اٹھ گے تیرا خواب اب تک بھی ہے اک خواب فنا
بھول جا گذری ہوئی باتیں کہ کچھ حاصل نہیں
پائے ہمت بدنما زنجیر کے قابل نہیں
گو وہ کتنی ہی خوش آئند و مسرت خیز ہوں
اور دامانِ خیال و وہم سے گل ریز ہوں
پھر بھی ہیں سب ہر طرح افسانہ و خواب وخیال
استخوانِ مردہ صد سالہ ہیں بے قیل و قال
ان کی تصویر خیالی صفحہ دل سے مٹا
دھیان بھولے سے بھی ان کا اب کبھی دل میں نہ لا
لیکن اتنا جس سے مل جائے سبق حسب رواج
حال کی جنگِ شریفانہ میں کام آئے جو آج

اٹھ مری جاں وقت جاتا ہے ڈھلا جاتا ہے دن
اور تو ہے خوابِ غفلت میں نہایت مطمئن
کان میں تیرے نہیں آتی وہ آواز خفیف
جنگ کو آتا ہے چپکے چپکے یوں تیرا حریف
اٹھ اکہ خطرہ آگیا ہے اور دشمن ہے قریب
اب جو تو سویا تو سو جائیں گے بالکل بے نصیب
تیز کرنے کا نہیں موقع صلاحِ جنگ کو
حاجت مہمیز ہے اب توسنِ شیرنگ کو
ہے یہی موقع اگر یہ بھی نکل جائے گا آج
گو ذرا آرام لیٹے لیٹے تو پائے گا آج
کل مگر جس وقت تو چونکے گا خوابِ ناز سے
کان کے پردے پھٹیں گے جنگ کی آواز سے
اور اٹھے گا جس گھڑی آنکھوں کو تو ملتا ہوا
دیکھ لے گا اپنے دشمن کو کہ وہ چلتا ہوا
خواب میں جس جنگ کے تو سو رہا ہے بے دھڑک
ختم وہ ہو جائے گی چونکے گا تو جس وقت تک

(زمانہ، کانپور جنوری ۱۹۰۸ء)

سفیر کاکوروی

نغمۂ صحرائی

جلوۂ قدرت دکھا اے ناگ پھن اپنا نکال
دل سمجھتا ہے تجھے بھی ایک شان ذوالجلال

باہر آجا نالۂ نے سُن کے لہراتا ہوا
اور اٹھا اپنا سر آسودۂ فکرِ مآل

ڈھونڈنے نکلے ہیں تیرے مسکن و منزل ہم آج
زیرِ نخلِ سایہ دار و زیرِ دامان جبال

صدقِ دل سے لائے ہیں ہم نذر کرنے کو ترے
شہد و شیر و میوہ ہائے خوش مزہ سے بھر کے تھال

عودِ سوزاں کی لپٹ سے عنبر فشاں ہے ہوا
لب پہ ہے تیری ثنا اور دل میں ہے تیرا خیال

امن و راحت سے رہیں تا اور نہ پہونچے کچھ گزند
آج خوشنودی تری ہو حق میں اپنے نیک فال

چال تیری مثلِ شبنم صورتِ آبِ رواں
برق کی تجھ میں جھلک خورشید کا جاہ و جلال

اے کہ تو ہے یادگارِ جنت الماوٰی جہاں
زندگی و مرگ و رنج و عیش کا ہے ایک حال

(زمانہ، کانپور نومبر ۱۹۱۸ء)

فراق گورکھپوری

مدّوجزرِ عرفان

دن ڈوبنے کو ہوتا ہے
جب چلتے ہیں ہوا کے جھونکے
جب تارے نکل آتے ہیں
گرندوں پہ دھندلکا پا کے
ہوتا ہے گداز انجم میں
رک رک کے ہوا چلتی ہے
کچھ جلوے نظر آتے ہیں
اور جان پہ آ بنتی ہے

پہلے اک سناٹا سا
خلقت پر چھا جاتا ہے
بے صبری مٹ جاتی ہے
اور چین سا آجاتا ہے
بنتا ہے خموشی ترنم
دکھتے ہوئے دل کا مرہم
اک بار بدل جاتی ہے
دُنیا کی ہستی برہم

اس وقت حقیقتِ پنہاں
ہوتی ہے نمایاں اکثر
ہو جاتے ہیں اعصاب بے حس
کھل جاتے ہیں روح کے جوہر

پر سے جیسے لگ جائیں اس وقت مری ہستی کے
سب مرحلے کٹ جاتے ہیں رفعت کے اور پستی کے

لیکن وہ مجبوری بھی رک جاتی ہیں جب یہ راہیں
جب کان ہیں سننے لگتے جب دیکھنے لگتی ہیں آنکھیں
جب چلنے لگتی ہیں نبضیں جب روح کو ہوش آتا ہے
اس جسم عنصری کا جو زنجیروں میں جکڑ جاتا ہے

"زمانہ" کانپور نومبر ۱۹۲۹ء

یادِ دوست

وہ مختصر سا قیام تیرا وہ عارضی سا سکون تیرا
پلک جھپکنے میں کٹ گیا یوں کہ جیسے اک خوابِ نیم تر تھا
بہارِ فانی کی رنگتوں سے شبِ محبت کی لذتوں سے
شبابِ رنگیں کی عشرتوں سے

ناآشنائے مسرتِ دل، بہارِ غم دیدۂ خزاں ہوں
ستم زدہ ہوں، الم زدہ ہوں، اکیلا مجبور و ناتواں ہوں
شبِ سیہ کی سیاہیوں میں دلِ حزیں کی تباہیوں میں
ازل سے محروم راحتوں سے

وہی ہے دورِ بہارِ فانی، وہی پھر عہدِ سکوتِ شب ہے
مگر مرا یہ شبابِ تلخ اب کچھ اس طرح مائلِ طلب ہے
کہ دہرِ فانی کو چھوڑ بیٹھے تری طرف منہ کو موڑ بیٹھے
اور آ ملے تری خلوتوں سے

دل حزیں شام سے سحر تک سحر کی ہی راہ دیکھتا ہے
مسرتوں کے خیال کو بھی بصورت آہ دیکھتا ہے
بس اب یہی آرزو ہے دل میں کہ ان طلسمات و رنگ میں
نہ لو لگائیں مسرتوں سے

گلاب زیب شب عروسی مہک رہا ہے جو بستروں پہ
تو موتیا بھی کسی کی زلفوں میں چھپ کے بیٹھا ہے زینتِ سر
سجی ہے پھولوں سے ایک جنت برس رہی ہے عجیب حسرت
جہان فانی کی رنگتوں سے

لئے ہوں حسرت کے داغ دل پر قرارِ دل سے سکون دل سے
تری محبت کے ہیں نشاں یہ انھیں میں سینچو نگا خون دل سے
یہ داغ ہیں تحفۂ محبت، یہ پھول ہیں ہدیۂ محبت
کہ تازہ ہیں دل کی حسرتوں سے

نیرنگ دہلی ستمبر ۱۹۳۳ء

فضل الرحمٰن

نیرنگِ زمانہ

زرفشاں اوس میں بھیگی ہوئی صبح
شنگرفی رنگ میں ڈوبی ہوئی صبح
محوِ سرگوشیوں میں مست نگار
جان اور دل سے طلب گارِ بہار

نکھریں جب تک نہ جوانانِ چمن
پورا جب تک نہ ہو ارمانِ چمن
آگے جب تک نہ زمیں پر سبزہ
موسمِ گل کے لئے چشم براہ

بھرتے ہیں چوکڑیاں چوپائے
گاؤں کے ناچنے والے جیسے
کھلے میدانوں کے گرویدہ چرند
چمنستانوں کے دلدادہ پرند

ادھر اک طائر شاداں لب ہے
ہے بلندی پہ غزل خواں کب سے
گم ہے کیسے اس کی گلستانوں میں
رنگ اور نور کے طوفانوں میں

کل تلک برف کی بارش تھی یہاں
نمی اور سردی کی سازش تھی یہاں
دشت و گلزار پہ چھایا تھا سکوت
چپ تھے طائر تھے موبشی مبہوت

آج سب فرط خوشی سے ہیں بحال
غم آئندہ نہ رفتہ کا ملال
نہیں انساں کی طرح ان کو الم
اپنے مستقبل و ماضی کا غم

نہ وہ یادیں جو ستاتی ہیں ہمیں
بھولے افسانے سناتی ہیں ہمیں
آگہی وہ ہے نہ وہ ہوش یہاں
فکر فردا نہ غم دوش یہاں

مسکرانا غم رفتہ پر وہ
رونا حالات گزشتہ پر وہ
عین نومیدی میں وہ شکل امید
شب آلام میں وہ عشرت عید

شادی و رنج ہیں دُنیا میں بہم
رنج اور شادی جہاں میں توام

ان تضادات پہ قائم ہے حیات
یونہی کٹتے ہیں بشر کے دن رات

بستر خار پہ سوتا ہے جو شخص
اپنی تقدیر کو روتا ہے جو شخص

جاگ کر خواب پریشان سے جب
دُور کرتا ہے غم و رنج و تعب

ہر نظارہ ہے اسے باغ و بہار
ہر صدا زمزمۂ موسیقار

آسمان اور زمیں آب و ہوا
ہر فضا اس کو ہے جنت کی فضا

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

فلسفہ محبت

چشمے دریاؤں سے دریا بحر سے مصروفِ پیار
ہے نسیم صبح بھی بادِ صبا سے ہم کنار
کوئی شے دنیا میں تنہا رہ نہیں سکتی کبھی
گر یقین قانونِ قدرت پر اگر ہے اعتبار
دوسرے کے وصل سے ہر ایک یاں مسرور ہے
ایک سے دو ہیں بھلے یہ تو مثل مشہور ہے
ہائے دنیا سے نرالا کیسے میں تنہا رہوں
دردِ فرقت سے بھلا میں کب تلک تڑپا کروں
آسمان اور کوہ کا آپس میں ہے بوس و کنار
موجیں دریا کی تڑپ کر چلتی ہیں مستانہ وار
گل کی خوبی پر مٹی جاتی ہے گلشن میں ہزار
شمع پر پروانہ اپنی جان کرتا ہے نثار

اپنے ہم جنسوں سے دنیا میں سبھی کو ہے پیار
جنس سے جس کو نہ الفت ہو وہ ہے بے اعتبار

ہے شعاع آفتابی بھی زمیں سے ہم کنار
موج دریا چاندنی سے کرتی ہے بوس وکنار

اختلاط قدرتی میرے بھلا کس کام کے
درد فرقت سے جو تڑپوں میں کلیجہ تھام کے

حفیظ ہوشیار پوری

ایک تنہا پھول

کسی سرسبز کیاری میں اِک دن
شرمگیں پھول اک بنفشہ کا
عاجزی سے جھکائے اپنا سر
میں نے دیکھا اگا ہوا تنہا
تھا وہی اور سوائے سبزہ کے
کوئی ہم جنس تھا نہ واں اس کا
تاکہ کوئی نہ دیکھنے پائے
اپنے سر کو لیا تھا اس نے جھکا

باوجود ان تمام باتوں کے
دل کشی میں ذرا نہ فرق آیا
رنگ اس کے چمک رہے تھے تمام
گرچہ ان پر تھا پڑ رہا سایا

سچ تو یہ ہے یہ پھول ایسا تھا
کسی گلزار میں اگر ہوتا
اپنے رنگوں کی دلکشی کے سبب
سارے لوگوں کے دل لبھا لیتا

پر قناعت تو دیکھئے اس کی
لب پہ آئی نہ اس کے چون وچرا
دست قدرت نے تھا اگایا جہاں
تھا وہیں گرچہ سر لیا تھا جھکا
خوبصورت تھے اس کے رنگ مگر
ان سے کچھ کچھ ٹپک رہی تھی حیا
اور وہ بھینی بھینی خوشبو کو
اس کیاری میں تھا بکھیر رہا
اسی وادی میں مجھ کو جانے دو
پھول دلکش ہے جس جگہ پہ اُگا
تاکہ میں بھی اس انکساری سے
سیکھ لوں زندگی بسر کرنا

محمد عبدالعزیز شوقؔ

کوہ قاف کی پری

کا کیشیا کی ایک دوشیزہ پری جمال
ہے دلربا نمونۂ قدرت کی اک مثال
گلزارِ حسن کا وہ طرحدار پھول ہے
ہاں سادگی کے باغ کا سردار پھول ہے
عشق اور عاشقی کی اُسے کچھ خبر نہیں
اس بھولے بھالے دل پہ ابھی کچھ اثر نہیں
زینت کو اس کے حسن کی زیور کوئی نہیں
پھر بھی تو اس حسین سے بہتر کوئی نہیں
کمسن حسیں ہے انجمن آرائے شوقِ دل
سچ ہے کہ سادگی ہے تمنّائے شوقِ دل
یہ چیز وہ ہے جس پہ بناوٹ نثار ہے
اس کی خزاں بھی غیرتِ صد نو بہار ہے
زینت ہے اس کے بالوں کی جنگل کا ایک پھول
دُنیا کا کوئی رنج اسے کرتا نہیں ملول
گویا کہ ہے وہ دشتِ مسرت کا اک غزال
راحت کا غم ہے جس کو نہ ہے رنج کا خیال
تفسیرِ دو جہاں ہے گُل اس کی نگاہ میں
نقش و نگارِ دہر ہیں نقشِ گیاہ میں
آزاد ہے وہ غم سے گناہوں سے پاک ہے
ہے صاف دل سے اور نگاہوں سے پاک ہے

پوشاک طرحدار کی پروا نہیں اُسے
کچھ حسرتِ حصولِ تمنّا نہیں اُسے
گلزارِ حسن کا وہ گُل خوش گوار ہے
وہ رُخصتِ بہار میں رشکِ بہار ہے

کرتے سے اس کے ہوتا ہے گورا بدن عیاں — کرتی ہے جس سے بادِ صبا چھیڑ خوانیاں
گورے بدن پہ پھول ہیں سارے چمک رہے — گویا ہیں چاندنی میں ستارے دمک رہے
صحرائی پھول زیبِ رُخِ دل نواز ہے — اس کو ہے فخر اس پہ اسے اس پہ ناز ہے
اس سادگی پہ رشک ہے جنت کی حور کو — اور کوہ قاف بنتی ہے حسرت ہے طور کو
اتری ہے وہ پہاڑ سے رفتارِ ناز سے — خود بچھ رہا ہے دامنِ صحرا نیاز سے
اپنے سفید پاؤں وہ نالے میں دھوتی ہے — قدرت کے ہر نظارے پہ بیخود وہ ہوتی ہے
ہر چیز دشت کی اسے سامان و ساز ہے — ہر شاخِ گل میں مظہرِ قدرت کا راز ہے
اب خود بخود ہے لب پہ ہنسی اس کے آ رہی — گویا ہے کوئی چیز اسے گُدگُدا رہی
ہیں نیلی آنکھیں اس کی خوشی سے چمک رہی — پیشانی مثلِ ماہ ہے اس کی دمک رہی
لہریں ہیں اس کے پاؤں سے محوِ نیاز و ناز — وہ دیکھتی ہے شوق سے قدرت کے سارے راز

اے خوش نصیب لڑکی تری قسمت اچھی ہے — باغِ خزاں رسیدہ میں یہ صورت اچھی ہے
دنیا کا رنج و غم کوئی اصلا نہیں تجھے — چرخِ ستم شعار کا کھٹکا نہیں تجھے
دامِ فریبِ دہر سے اب تک تو دور ہے — اے خوش نصیب رخ پہ ترے پاک نور ہے
اے مرکزِ زدائرۂ حسنِ انتخاب — یہ سادگی ہے لاکھ بناوٹ کا اک جواب
حسن آفریں سہی پہ تو ناز آفریں نہیں — اے شمعِ حسن تجھ سا کوئی بھی حسیں نہیں
تو دلربا ہے تجھ کو مگر کچھ پتا نہیں — تیرے جمالِ پاک کا شہرا ہوا نہیں
دیکھی نہیں ہے تو نے مصیبت کی زندگی — دنیا کے درد و رنج کی فرقت کی زندگی
لے جائیں تجھ کو لوگ نہ تیرے وطن سے دور — اے شمعِ حسن تو نہ ہو اس انجمن سے دور

تیرے وصال کی نہ تمنّا کرے کوئی — یونہی تری بہار کو دیکھا کرے کوئی
اے گل تجھے لگے نہ کبھی عشق کی ہوا — سادہ رہے ہمیشہ ترا حسنِ خوش ادا

تا زیست برقرار تری سادگی رہے
صورت یہی رہے تری سیرت یہی رہے

مخزن جون ۱۹۰۹ء

فضلُ الرحمٰن

یاد

جنوں کا قصہ چھڑتا ہے خرد کی جب عدالت میں
گزشتہ حادثے جب پیش ہوتے ہیں شہادت میں
دلِ بے تاب کو تڑپاتی ہے جب یادِ ماضی کی
وہ بزمِ گم شدہ وہ محفلِ برباد ماضی کی
بجھے دل سے مرے جب طرفہ انگارے نکلتے ہیں
مری خشک آنکھوں میں جب نت نئے طوفان مچلتے ہیں
نظر میں پھرتی ہیں شکلیں عدم کو جانے والوں کی
محبت بارِ دیگر ابتدا کرتی ہے نالوں کی
حیاتِ رفتہ کے زخم از سرِ نو تازہ ہوتے ہیں
پلک کے اشک سینے کے قدیمی داغ دھوتے ہیں
نہیں ملتی رہائی دم بھر آزاروں کی کاوش سے
ادا ہوتی ہے قیمت غم کی چشمِ تر کی بخشش سے
تصور میں مگر جب تیری شکل آباد ہوتی ہے
زیان و سود کے جھگڑوں سے جان آزاد ہوتی ہے

بشکریہ انگلش اردو ٹرمس اورینٹل ایجنسی ۱۹۷۶ء

وفا صدیقی

گنہگارِ محبت

اے مہِ حسن و جمال اے بتِ خورشید عذار
سیکڑوں آہوئے صحرا تری آنکھوں پہ نثار
جس طرح طائرِ بے خوف اڑا کرتے ہیں
اُڑ کے کر لیتے ہیں افلاکِ معلیٰ کا حصار
کی ہو میں نے نگہِ چشمِ محبت تم پر
دردِ دل کا اگر اشکوں نے کیا ہو اظہار
جز نظر تار رفیقِ دل مہجور نہ تھا
شوقِ دیدار نے آنکھوں کو کیا تھا لاچار
میں نے مانا کہ گنہگارِ نظر بازی ہوں
کیا کروں اس کو کہ مجبور تھے یہ دیدۂ زار
بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

دست حسرت نے اگر کی ہو کوئی گستاخی
ہو کے بیتاب بنے ہوں جو گلے کا ترے ہار
بادۂ شوق محبت میں اگر ہو کر مست
ہو گئے ہوں یہ کبھی مائل آغوش و کنار
اپنے آغوش محبت میں تمہیں لے لیکر
ہو کے بیتاب یہ نکالے ہوں جو ارماں دو چار
صورتِ زلف یہ پہنچے ہوں اگر تا بہ کمر
ہو کے قربان چھوئے ہوں جو تمہارے رُخسار
نذر کرنے کے لئے لائے ہوں تحفے یہ اگر
ریگ کی طرح کہ ممکن ہی نہیں جن کا شمار
بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں اِن کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار
لب عشاق نے کھینچی ہو اگر آہ کوئی
ہو کے سرگرم فغاں دل کا نکالا ہو بخار
ہو کے مجبور اگر عرض تمنا کی ہو
لب نازک سے جو بوسوں کا لیا ہو اقرار
ضبط اُلفت سے جو فرقت میں رہے ہو خاموش
رخِ زیبا کی ثنا میں جو پڑھے ہوں اشعار

الغرض جوش محبت میں اگر ہو کر مست
لے لئے ہوں لب نازک کے جو بوسے دو چار
ہو کے بے درد نکالی ہو تمنّا دل کی
لب جاں بخش کو کھینچا ہو اگر کچھ آزار
بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں ان کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار
قصّۂ درد و الم تم کو سنایا ہو اگر
آہیں بھر بھر کے نکالا ہو اگر دل نے غبار
ہو کے پامال جفا ہجر میں تڑپا ہو اگر
بے قراری میں رہا ہو نہ اگر صبر و قرار
نام اغیار کا لے لیکے شکایت کی ہو
نالہ بن بن کے سنائی ہو اگر حالت زار
داغہائے دل پُر درد کی تسکین کے لئے
بن کے مظلوم ہوا ہو جو ترا شکوہ گذار
ہو کے مجبور تقاضائے محبت سے اگر
حسرت و یاس و تمنّا کا کیا ہو اظہار
بخش دو تم جو سمجھتے ہو خطائیں ان کو
کون کرتا ہے محبت کو خطاؤں میں شمار

دُرِ ثمین ۔ مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۶ء

فضل الرحمٰن

سچّی محبت

ہوں دو دل ایک۔ اجب سمجھو کہ ہے یہ بیاہ ذہنوں کا
یہ رشتہ ٹوٹنے والا نہیں ناگاہ ذہنوں کا
کسی کی آنکھ پھرنے سے پھرے وہ جو طبیعت کا
کسی دامن کے چھٹنے سے جو چھٹ جائے وہ چاہت کا
نظر کا تیر وہ ناوک نشانہ بے خطا جس کا
قدر انداز وہ پرفن ہدف ہے دل سدا جس کا
محبت وہ سفینہ ہے جسے طوفاں کنارا ہے
کرے دنیا کا بیڑا پار جو یہ وہ ستارا ہے
بدل سکتا نہیں دل کو فریب پیر گردوں تک
کہ نیرنگ زمانہ ہے لب و رخسار گلگوں تک
ریاض حسن اجڑتا ہے یہ آزار خزاں ہے عشق
نسیم باغ جنت ہے بہار جاوداں ہے عشق
اگر دھوکہ ہے جذب الفت صادق زمانے میں
نہ ہیں شاعر نہ کوئی باوفا عاشق زمانے میں

انتخاب اردو پیس اورینٹل کالج میگزین ۱۹۶۱ء

خلیق دہلوی

یادِ محبوب

اے شگوفو! امنہ تمہارے شہد سے معمور ہیں
تم گلستانِ جہاں میں ہو نہایت خوش گوار
یاد ہے لیکن مجھے ایسا گلِ نوخاستہ
جو کہ تم سے بھی زیادہ تھا مہک میں مشکبار
یاد آ رہے چیتے ہے ایسا نازنیں نازک کمر
سامنے جس کے نہیں کچھ چیز رعنائی تری
اور اے شمشاد وہ قامت قیامت خیز تھا
سربلندی روبرو جس کے ہے شرمائی تری
اے نسیم ناز ہیں پیاری تیری اٹکھیلیاں
یاد رہ رہ کر مگر آتا ہے وہ نازک بدن
بس گئی تھی خون میں جس کی ہوائے عطر بیز
تازگی بخش جہاں تھا مثلِ گل ہائے چمن

یاد مجھ کو ایک ایسی نازنیں آواز ہے
جس طرح ہوتی ہے رِم جھم بارشِ فصلِ خزاں

ہائے اس آوازِ دلکش کو نہ پہنچ سکتی نہیں
لاکھ ہلکی چال سے بیجوش ہوندی رواں

اے شبِ تیرہ کی بجلی تو درخشاں ہے مگر
وہ نگاہ برق وش تجھ سے زیادہ تیز ہے

خرمنِ اُمید پر گرتی ہے کیا کیا کوند کر
الاماں موسیٰ کہیں، ایسی شرر انگیز ہے

ہائے وہ دل جس کی میرے دل سے راہ و رسم تھی
تیرے وحشت خیز دل سے تھا بہت بہتر عقاب

مثلِ آہوئے رمیدہ تھا خلیق زار وہ
لا سکا اُس کو نہ کوئی دامِ اُلفت میں جناب

دُرِّ ثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدر آباد ۱۹۲۶ء

مرزا شہید امرتسری

ایک غمزدہ کی بہار!

اے سایۂ نازشِ گلستاں
اے فصلِ بہار! نزہت آثار
افسوس کہ تیرا خیر مقدم
ہے اور میں ہوں افتادہ بیمار
پہلے کی طرح سے بج بجا کر
ہو سکتا نہیں ہے تیرا دیدار

خوبان تیرے فرشِ گل زمیں پر
گر محوِ خرام دل بری ہوں
اور پھولوں کی تازہ پتیوں کی
تزئین سے غیرتِ پری ہوں
کرنے دے خوشی انھیں دُعا لے
اُمیدیں تری ہری بھری ہوں

اس وقت میں ساتھیوں سے پیچھے
رہ جاؤں اگر بزیرِ دیوار
ہرگز نہ سمجھنا یہ کہ مجھ کو
کم ہو گیا تیرا شوقِ دیدار
بااب تیری دل فریبیوں سے
ہے میرا دل شکستہ بےزار

میرے دل غمزدہ میں بے شک　　اُلفت ہے تری ہنوز کامل
لیکن وہ زمانہ اب نہیں ہے　　نہ رہی وہ میری رفیع منزل
میں بے خبر غمِ زمانہ　　اب عشرت عشق سے ہوں غافل

اک زمزمۂ لطیف تیرا　　تھا مشغلہ سخن سرائی
افسوس کہ اب ہوا فراموش　　بیجا ہے تلاش دل کشائی
کر مجھ کو معاف اے مری جاں　　اور دیکھ یہ عذر بے توائی

عالم شدہ خرمم از نویدت
الا ہمہ غافل از شہیدت

درثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

وفا صدیقی

تغیر زمانہ

ہم نے یہ مانا کہ دنیا ہے پراز رنج و ملال
ایک دن فصل بہاری سب کو کردیگی بحال
صبح صادق آئے گی اور آکے پھیلائے گی نور
فصل گل سے ہونگے سب وارفتہ عیش و سرور
پھول گلشن کے بھلادیں گے غم و رنج و محن
آج جو کرتے ہیں ماتم کل وہ ہونگے خندہ زن
رنج کیوں کرتے ہیں دنیا میں یہی معمول ہیں
خار کے انبار جو ہیں آج وہ کل پھول ہیں
ہوں مصائب لاکھ دنیا میں مگر پھر کیا کریں
اس سے کیا حاصل کہ دن بھر رات بھر رویا کریں
ایک ذلّت ہی نہیں دنیا میں عزت بھی تو ہے
اک مصیبت ہی نہیں دُنیا میں راحت بھی تو ہے

صبر اے دل اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں
اس طرح پر وقت کو کھونے سے کچھ حاصل نہیں

کیا نتیجہ اس قدر رونے سے ہے زار و قطار
ہے مصیبت آج، کل راحت ملے گی بے شمار

باغ دل میں حسرتیں جو ہیں جمع ہیں بو کی طرح
کل بھریں گی چوکڑی صحرا کے آہو کی طرح

کل یہ ہوگی جان شاداں آج ہے جان حزیں
ایک حالت پر کبھی دنیا صدا رہتی نہیں

در ثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدر آباد ۱۹۲۶ء

سیفیر کاکوروی

تقدیر

نارسائی سے تری بخت یہ کیا ہوگا
مجھ کو تجھ سے نہ کبھی شکوہ بیجا ہوگا
میں نہ ہوں گا کبھی امداد کا خواہاں تجھ سے
تیرا اے بخت نہ احسان گوارا ہوگا
بن گیا ہے تو مری جان کا دشمن لیکن
سر جدا ہو، نہ جدا سر سے یہ سودا ہوگا

ٹوٹ بھی جائیں اگر میری امیدوں کے طلسم
کم نہ ہرگز یہ مرا ذوقِ تماشا ہوگا
مٹ گئے پیشِ نظر تھے جو مرقع دلکش
تیرے بس میں نہ مگر دیدۂ بینا ہوگا
مل گئی خاک میں گو سلطنتِ وہم خیال
اس خرابے میں گرانمایہ خزانا ہوگا

کر دے بیگانہ مجھے نغمۂ شادی سے مگر
یادِ ایام کا دل چسپ فسانا ہوگا
زمزمے آ کے سُنائے گی نسیم اشراق
طبع مواج میں اک شور سا پیدا ہوگا
راگ موجوں کا سنوں گا صفتِ تارِ رباب
پیچ میں حلقۂ گرداب ترانا ہوگا

لاکھ تو لذت گفتار سے کر دے محروم
لب پہ لیکن نہ کبھی حرف تمنا ہوگا
گنگ ہو جائے اگر میری زبان گویا
دل نالاں صفت بلبل شیدا ہوگا
باغ میں نغمۂ پر شور عنادل ہوں ہزار
نالۂ دل کا مگر رنگ نرالا ہوگا

گو تپ غم سے نہ ہو طاقت رفتار مجھے
فکر رنگیں سے زمانہ تہ و بالا ہوگا
بڑھکے ہے بادِ صبا سے یہ مرا توسن فکر
گرم جولاں روشِ آہوئے صحرا ہوگا
آسماں رس فرسِ فکر رسا ہے میرا
خاک سے اڑکے رواں تا بہ ثریا ہوگا

آرزوئے دل ناکام ہے خود مثل حباب
ٹوٹ کر قطرہ مگر شامل دریا ہوگا

نقش بر آب ہے ساری ہوس نام ونمود
فکر کیا میرا مخالف جو ستارا ہوگا

قطرۂ غم کو ڈبو دوں میں نہ لطف عمیم
نذرِ تسلیم ہمیشہ دل دانا ہو گا

دُرِّ ثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

فضل الرحمٰن

زندانی کا پیام

اپنی محبوبہ کے نام

جس دم بہ فضل کبریا عشق و وفا کا دیوتا
ڈالے جو غایت کی نظر میکر درو دیوار پر
اور پھر شب خاموش میں تجھ کو مری آغوش میں
پہنچادے تا وقت سحر دکھلاوے قدرت کا اثر
زلفیں وہ دام پر شکن آنکھیں حسیں ناوک فگن
جس کیف سے نا آشنا سات آسمانوں کے خدا

اس کیف سے دلشاد ہوں
میں قید میں آزاد ہوں

ساغر شراب ناب کے انجم وہ بزم خواب کے
کرتے ہوں گردش تیز تر نظروں میں ہوں جب جلوہ گر
پھولوں کے سہرے زیب سر سینوں میں شعلوں کا اثر
جام صحت کے دور ہوں سامان عشرت اور ہوں

ہم دونوں مل کر جب باہم	کر دیں غلط ہر ایک غم
از ماہ تا ماہی کوئی	دیکھے نہ ایسی بے خودی

یوں اب طرب ایجاد ہوں
میں قید میں آزاد ہوں

جب تک کہ دل آزاد ہے	بزم خیال آباد ہے
زنداں کی دیوار سیہ	یہ آہنی حد نگہ
مجبور کر سکتی نہیں	مجبور کر سکتی نہیں
مرغ پریشاں کے لئے	اس طائر جاں کے لئے
کنج قفس آرام کہ	مجلس ہے راحت کی جگہ
قربان جام عشق کے	عیش مدام عشق کے

گویا ملائک زاد ہوں
میں قید میں آزاد ہوں

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

محمد سیف الدین شباب

ہستی

اے شمع زندگانی! آخر لبِ اجل نے
یک بار جب بجھی تو، اس طرح تجھ کو پھونکا

ممکن نہیں کہ روشن پھر ہو شرار تیرا
اس تیرہ خاکداں میں کیوں کر گذر ہو میرا

اے نخلِ زندگانی! پائے خزاں نے تجھ کو
افسوس بیخ و بن سے پامال کر کے چھوڑا

ممکن نہیں کہ پھر تو سرسبز بارور ہو
جو نخل ہو چکا ہو [illegible]

اے وجہِ زندگانی! تلخی دہر نے یوں
ہم کو بنا دیا ہے جوں لفظ ہوں شکستہ

فی الاصل ایک تھے ہم جب سے ہوئی جدائی
بے جان ہو کے قالب باقی نہیں رہے گا

در ثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

سفیرؔ کاکوری

اسماء حسنیٰ

مالک و مولا ہمارے اے خدائے مہرباں
اے محبّت کے خزانے گنج اسرار نہاں
قبضۂ قدرت میں تیرے گردش دورِ زماں
مظہر جبروت ہیں، بحرِ رواں، باد و زاں
کلمہ گویاں ہیں ترے ہم یا حفیظ یا حمید

جان و دل سے ہے تو پیارا اے خداوند عزیز
اے فروغ نور ایماں ہادیٔ عقل و تمیز
اے عفو تسکین بخش ہول روزِ رستخیز
نام نامی ہے ستاروں تک میں تیرا نور بیز
کلمہ گویاں ہیں ترے ہم یا غفورُ یا غنی

جیتے ہیں ہم آرزو میں تیری حتیٰ لایموت
ذکر میں تیرے ہیں نطق فکر میں تیرے سکوت

بھیجتا ہے تو شعاع مہر تاباں تا بہ حوت
اور اُگاتا ہے زمیں سے تو ہی سب اشیائے قوت
کلمہ گویاں ہیں ہمیشہ تیرے وہّاب الوحید

تیری قدرت سے یہ جسمی اور روحانی قویٰ
دم بدم لحظہ بہ لحظہ پاتے ہیں نشو و نُما
روز افزوں ہے جہاں میں قوت فکر رسا
رہگزار دہر میں یعنی ہے تو ہی رہ نُما
کلمہ گویاں ہیں ترے ہم یا قدیرُ یا قوی

یہ تری بزم تجلّا ہے ہماری زندگی
سر بسر اعجاز قدرت ہے جہانِ عنصری
حُسن بے ہمتا کو منظور اک نمائش اپنی تھی
بس اُسے ذوق تماشا کی ہے اک جلوہ گری
کلمہ گویاں ہیں ہمیشہ تیرے رحمان الرّحیم

دُرِّ ثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

حامد اللہ افسر میرٹھی

اے مرے پیارے وطن

کیا سناؤں حال دل کیوں کر نوا پرواز ہوں
اس صداؤں سے بھری دنیا میں بے آواز ہوں

اے مرے پیارے وطن!

اس مرے ٹوٹے ہوئے دل کا بنا لے اک رباب
پھر محبت کے ترانے سن جہاں ہیں انتخاب

اے مرے پیارے وطن!

میں تجھے کیا دوں کہ بے بس اور اک نادار ہوں
کیا سہارا دوں تجھے مجبور ہوں ناچار ہوں

اے مرے پیارے وطن!

زندگی میری کنول کا پھول بن جاتی اگر
میں تو قدموں پر ترے سو بار رکھتا اپنا سر

اے مرے پیارے وطن!

دُرِ ثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدر آباد ۱۹۲۷ء

احسن اکبرآبادی

کنول

خفتہ جہاں ہیں مارِ سرِ شاخ کو کنار
آہستہ روِ پلنگ کے رستے ہیں بار بار

ہیں شعلہ بار کرمکِ شب تاب اس قدر
روشن ہیں دور دور کی راہیں وہ پیچدار

ٹھٹکے ہوئے جہاں ہیں وحوشِ رمیدہ خو
اور ہیں سبک خرام غزالانِ شرمسار

دن ڈوبتا ہے گو یہ عیاں ہے چمک فزوں
ہیں تابناک طوطیوں کی کلغیاں ہزار

سننا ذرا! کنول ہیں یہ بالائے سطحِ آب
جنبش میں جیسے ہو کوئی طناز محوِ خواب

قشقہ لگائے ماتھے پہ ہے چرخ نیلوفر!
یعنی بہ شان و شوکت و تمکین و کرّ و فر

جلوہ فگن اُدھر مہ زریں نقاب ہے
اور خوفناک معبد صحرائی ہیں ادھر

رقصاں جو باد تند تھی، اب ہو کے نیم جاں
غش کھا کے "شب" کے قدموں پہ رکھتی ہے اپنا سر

پُر رمز، کچھ سکوت میں آوازیں گاتی ہیں
خاموش! دیوتاؤں پہ نذریں چڑھاتی ہیں

"دُرِّ ثمین" مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

سفیر کاکوروی

کنول

ذرّے ذرّے سے ہے یارب تیری قدرت آشکار
شاہد صنعت ہیں گلزار جہاں کے برگ و بار

شام کا وقت اور سوادِ دشت و بیرِ آب جو
جس جگہ پر سانپ لہراتے ہیں زیر کو کنار

چُپکے چُپکے جس جگہ چلتا ہے چیتا رات کو
جھاڑیوں میں جس کی آنکھوں سے نکلتے ہیں شرار

آہوانِ دشت رہتے ہیں جہاں نازک خرام
جو بھڑک اُٹھتے ہیں جگنو کی چمک سے بار بار

اک مقام ہو، ہے یہ سنسان جنگل اور یہاں
نرم و نازک نیلوفر ہے ناز پروردِ بہار

دھوپ کچھ کچھ ہے پرندوں کے پروں کو وقتِ شام
آسماں پر اڑ رہے ہیں جو قطار اندر قطار

زیب سیمائے فلک یہ قرص زریں کی نمود
سبزہ رنگوں کی جبیں پر جیسے ٹیکا آشکار

آرہی ہیں ہر طرف سے یہ ہوائیں جاں فزا
اپنے نغموں سے جو کرتی ہے شٹئے کردگار

وقت خلوت جن کا جنگل کی سہانی شام ہے
ہیں پرستش گاہ جن کے سب یہ دشت و کوہسار

ایسے دلکش وقت میں اک خوابِ شیریں کی طرح
جھومتا ہے آب جو پر نیلوفر مستانہ وار

رسالہ "زمانہ" کانپور جولائی ۱۹۱۳ء

محمد سیف الدین شباب

موت اور زندگی

"پھیر کر سر پیٹھ پر سے ہاتھ میرے موت نے
اس طرح سرگوشیاں کیں مجھ سے مہرو درد سے"

"جانِ من! کیا تجھ کو اس غم سے میں وارستہ کروں
پھر تجھے مسرور اور پھر کیا تجھے پیدا کروں"

"کیا ترا قالب خوشی کی بے خودی میں ہو عیاں
یا کسی لوٹن کبوتر میں ہو پیدا تیری جاں"

"یا مگس میں جو ہو شیدائے گل نیلوفری
یا مصفّا اور روپہلی دھاریں برسات کی"

"یا تر و تازہ زمینوں کے شگفتہ پھول کی
روح پرور دل کشا بوؤں میں بسادوں جاں تری"

"ساز آوازِ نسیم دشت میں کر دوں تجھے
یا ترانوں میں صدائے موجِ خوں بھر دوں تجھے

کہہ اُٹھا میں جبکہ کرم آمیز ہمدردی تری
وجہ مجوبی ہے اور ہے باعثِ شرمندگی"
"سچ بتا اے موت! کیا اس طرح میری زندگی
ہائے اب بیکار اور بے صرفہ آخر ہو گئی"
"روح لرزے گی مری یا جسم گھبرائے گا کیا
نزع کی تکلیف سے جس دم کہ ہوگا سامنا"
"یا مری جاں جائے گی قالب سے اس کے پیشتر
وہ ملے مجھ کو کہ جو ہے منحصر تقدیر پر"
یعنی نغمہ سنجیٔ دل بستہ شعر و سخن
یا ادائے حاجت و خدمت گذاری وطن

(نور) در ثمین مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

فضل الرحمٰن

چاند کی دیوی

پاک دامن ملکہ صید فگن
چہرہ معصوم نگاہیں پرفن

جب سے خوابیدہ ہے خورشید مبیں
سر پہ رکھے ہوئے تاج تزئیں

تخت سیمیں پہ ہے تو جلوہ نما
رات بھر اپنی پھبن یونہی دکھا

آنکھ کھولے ہوئے اول شب سے
منتظر زہرۂ گردوں کب سے

چاند کی دیوی حسیں ملکۂ نور

نہ پڑے تجھ پہ زمیں کا سایہ
پر حسد زال حسزیں کا سایہ

تیرگی چہرہ نہ دکھلائے کبھی
رخ رخشندہ نہ گہنائے کبھی

محفل شب رہے تاباں یونہی
شمع رخسار درخشاں یونہی
جلوہ دکھلا چمن آرائی کر
تا سحر انجمن آرائی کر
چاند کی دیوی حسیں ملکۂ نور

در و گوہر کی یہ تابندہ کماں
رکھ دے دم بھر کے لئے جانِ جہاں
اور یہ تیرا بلوریں ترکش
یہ ترے تیر نگاہ دلکش
رم شدہ آہو کو اب فرصت دے
سانس لینے کی ذرا مہلت دے
ہے ترے حسن میں جادو کا عمل
رات کو دن میں تو دیتی ہے بدل
چاند کی دیوی حسیں ملکۂ نُور

انگلش اردو پوئمس اوریئنٹ لانگمنس ۱۹۶۱ء

سیفر کاکوروی

نغمۂ آبگیر

گھر تک تو بھری گگری سنبھلے گی یہ مشکل سے
دل بیٹھا سا جاتا ہے اب دوری منزل سے

متوالی رہوں کب تک ملّاح کے گانے میں
گھر جانا بھلا بیٹھی بھایا جو مجھے دل سے

یہ رات کا سنّاٹا دھاڑیں یہ درندوں کی
آواز سنی جاتی ہے چرخ کی مشکل سے

رات آئی اندھیری اور اُلّو کی صدا آئی
کالے نہ کہیں نکلیں ڈر ہے سم قاتل سے

قسمت سے نہیں ہے جو چاند آج چراغ رہ
جمنا کی یہ موجیں بھی کیا کم ہیں سلاسل سے

اس حالت غربت میں اس رنج و مصیبت میں
یارب تو بچا لینا موجِ لب ساحل سے

بھائی تو خفا ہوں گے آنے میں لگی کیوں دیر
ماں باپ کے دل کو بھی صبر آئے گا مشکل سے
رو رو کے خدایا وہ مانگیں گے دُعا تجھ سے
گھبرائیں گے جمنا کے اندیشۂ باطل سے
بجلی جو چمکتی ہے میں بچ کے کدھر جاؤں
طوفاں نظر آتا ہے اٹھتا لب ساحل سے
ہے رات کی تاریکی یا زاغ سیہ کے غول
اڑتے چلے آتے ہیں جمنا پہ مقابل سے
یا رب تری رحمت کا ہر وقت سہارا ہے
اور تو ہی چھڑانے والا بندوں کو ہے مشکل سے

دو شمین مرتبہ تصدق حسین تاج — حیدر آباد ۱۹۲۷ء

محمد سیف الدین شباب

سوزِ بیوگی

نہ ہو حاصل اُسے کچھ دلبریٔ روئے انور سے
کیا ہو موت نے جس کو جُدا آغوشِ شوہر سے

لباسِ ریشمی و جامہ زیبی کی ضرورت کیا؟
طلائی زیور سے چوڑیوں کی اس کو حاجت کیا؟

بھلا خواہ گل و گوہر ہوں سر کے بال پھر کیوں کر؟
چنیں کس کے لئے کلیاں چنبیلی کی سر بستر؟

وہ آئینہ کہ جس میں حُسنِ شانِ کتخدائی تھا
نہ کیوں اب پھینک دیں اسکو کہ ہے اس کی ضرورت کیا؟

وہ دستِ ناز جن کا غازۂ رُخ خونِ حسرت ہے
کریں کیا خواہشِ رنگِ حنا کافی یہ رنگت ہے

مسّی آلودہ کیا وہ لب ہوں جن پر آہ رہتی ہے
لگائیں سُرمہ کیا آنکھوں سے سیلِ اشک بہتی ہے

چلو اب چھوڑ دو حاجت نہیں شفاف چوڑیوں کی
ملیں آرائشیں مٹی میں اجڑی دل کی جب بستی

گرستہ اس کو کر دو تخم رنج و غم کے بوئے ہیں
مقدس رشتہ کے جس تار میں موتی پروئے ہیں

نہیں ممکن کہ رنج و غم میں [illegible] ہو
نکالو ان طلائی بیڑیوں کو پاؤں سے پھینکو

ہٹا دو منہ سے مقنع، اڑ گیا رنگ رخ انور
اڑھا دو آج اک چادر کفن کی حسن زندہ پر

غرض کیا اس سے حاصل ہم تو دے سکتے نہیں تسکیں
بہت ڈھونڈا نظر آتی نہیں ہم کو کہیں تسکیں

بجا ہے دل جو اس حسرت کدہ میں نقش حیرت ہے
امیدیں خود گریزاں اور نا قائم مسرت ہے

ہجوم رنج سے دل میں تو اک محشر بپا ہو گا
تمناؤں کا میٹھا درد کیا کیا چھیڑتا ہو گا

شب تاریک تنہائی بسر ہو گی تو مشکل سے
کہ جب گھبرا اٹھے گی وہ لپٹ جائے گی خود دل سے

تلے میں آج سیل اشک جو آنکھیں بہاتے ہیں
پتا دیتے ہیں اس کی عمر خامی کا زمانے میں

در تمہید مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

ضامن کنتوری

دل اندوہگیں

وہ دل پھنسا ہو جو بے ہودہ حسرت و غم میں
مثال اس کی ہو بعینہ ہے ایسے عقرب کی

گھرا ہو چار طرف سے جو حصنِ آتش میں
کسی طرف سے نہ ہو راہ مخلصی ملتی

اور اس تعب سے پریشان ہو کے چکر کھائے
کہ جس سے اور ہو نزدیک آگ کی گرمی

جب اس تپش کی کسی طرح تاب لا نہ سکے
تو مشتعل ہو بہت آتشِ غضب اس کی

جنون کے جوش میں کچھ اور اس سے بن نہ پڑے
چلے وہ چوٹ ہمیشہ جو اس کی عادت تھی

وہ نیش دیتا تھا زک مدعی کو جس سے مدام
خطا نہ کرتا تھا دشمن پہ وار جس کا کبھی

خود اپنے سر پہ اسی نیش سے لگائے زخم
کہ دے کے جان ہی پائے عذاب سے چھٹی

اسی طرح سے ہیں جیتے وہ تیرہ رائے بھی جان
ہے گھیرے آگ جنہیں چار سمت سے غم کی
نہ دین ہی کے وہ رہتے ہیں اور نہ دنیا کے
یہی مآل ہے ان کا ہو جن پہ غم حاوی

ارمغان فرنگ ۱۹۰۱ء

سفیر کاکوروی

املتاس کا پھول

اے املتاس تجھے کیوں گلِ صحرا کہیے
صورتِ سبزہ ہے پامال مگر کیا کہیے

کوئی ٹوٹا ہوا تارہ ہے تو افتادۂ خاک
یا تجھے طالعِ شوریدہ ہمارا کہیے

جامِ زرینِ مئے ہوش رُبا ہے گویا
یا تجھے شمعِ تہِ دامنِ صحرا کہیے

ساقِ سیمین پری کی ہے سنہری پازیب
موسمِ گل کا تجھے نقشِ کفِ پا کہیے

[illegible]ے دلہن محوِ خیالِ طفلی
ڈبڈبائے ہوئے اشکِ ستم آرا کہیے

شامِ غربت میں کوئی خوابِ پریشاں ہے تو
یا تجھے غولِ فریبندۂ صحرا کہیے

رونما پرِ طاؤس ہے تیرا جلوہ
دیدۂ آہوئے رم دیدہ کا نقشا کہئے

زرد شکلِ رخ مجنوں ہے بیاباں میں تو
گرد آلودہ خم طرّہ لیلا کہئے

غلِ داغ جگر عاشق محزوں ہے تو
تجھ کو مغز سر آمادۂ سودا کہئے

دُرِ ثمین مرتبہ تصدّق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

محمد امیر

تارے اور شبنم

خاموشیوں میں شب کی جب دل سکوں ہے پاتا
میں آکے بیٹھتا ہوں مہتاب میں نہاتا

حیرت سے دیکھتا ہوں تاروں کی جگمگاہٹ
گل ہائے آسماں کی پرکیف مسکراہٹ

آتا ہے چاند سر پر اوڑھے سفید چادر
جیسے کوئی حسینہ آئے چمن کے اندر

چُن چُن کے جو گلوں کو پھینکے زمیں کے اوپر
جلدی سے بھاگ جائے پھر باغباں سے ڈر کر

محوِ نظارہ یوں ہی رہتا ہوں اک پہر میں
پھر خوابگہ میں جاکر سوتا ہوں تا سحر میں

اٹھتا ہوں جب سویرے راحت کی نیند سوکر
پاتا ہوں صحن گردوں تاراج اور ابتر
اک پھول بھی فلک پر آتا نظر نہیں ہے
چنتا ہے کون گلچیں ہوتی خبر نہیں ہے

شاید یہ پھول سارے شبنم میں ڈھل گئے ہیں
سبزہ پہ دیکھو موتی لاکھوں چمک رہے ہیں
معصوم لڑکیاں ہیں ان موتیوں کی شیدا
پچھلے پہر سے اٹھ کر پھرتی ہیں باغ و صحرا
چننے کے واسطے جب وہ ہاتھ ہیں بڑھاتی
کرنیں ہزاروں آکر موتی اڑا ہیں جاتی
وہ کھل کھلا کے ہنستیں سبزہ پہ لوٹ جاتیں
گا گا کے گیت میٹھے شاعر کا دل ہلاتیں

آنند نرائن ملاؔ

لوری

نیلے آکاش سے اونچے کیلاش سے
لائی تیرے لئے ہیں شتاب
ہلکا ہلکا سا اک پیارا پیارا سا اک
ننھی آنکھوں کا ننّھا سا خواب

دھان کے کھیت سے کھیت کی ریت سے
چُن کے لائی ہوں میں بے حساب
مسکراتے ہوئے جگمگاتے ہوئے
دھانی دھانی سنہرے سے خواب

باغ میں جھیل پر کچھ کنول ہیں جدھر
اور روش پر کھلے ہیں گلاب

میں اُسی کنج سے لائی ترے لئے
بھینا بھینا نشیلا سا خواب
کھیلتے ہیں جہاں ہولی ارض و سما
ڈوبتا ہے جہاں آفتاب
واں سے آتی ہوں میں ساتھ لائی ہوں میں
ایک رنگین گلابی سا خواب

نازنیں تتلیاں پی رہی ہیں جہاں
جامِ گل سے سنہری شراب
ان سے چھپ چھپ کے میں لائی چپکے سے میں
میٹھے میٹھے رسیلے سے خواب

مُند گئیں انکھڑیاں رُخصت اے میری جاں
ڈھل چلی ہے ستاروں میں تاب
سو رہو ننھی رات بھر دیکھ اب تا سحر
ایک معصوم بے لوث خواب

محمد حسین آزاد

بڈھا باپ

ایک لڑکے نے یہ بڈھے باپ سے اپنے کہا
آپ کا ظاہر میں ہے یوں تو بڑھاپا آ گیا
بال ہے اک اک سفید اب آپ کے سر کا ہوا
فرق لیکن تندرستی میں نہیں آیا ذرا
مہربانی سے مجھے اس کا سبب دیجئے بتا
باپ نے سن کر دیا لڑکے کو اپنے یہ جواب
اے مرے پیارے! مرا تھا جن دنوں عہد شباب
میں سمجھتا تھا جوانی جانے والی ہے شتاب
اس لئے کرتا نہ تھا میں اپنی طاقت کو خراب
پھر بڑھاپے میں جوانی کا مجھے غم ہو تو کیا
پھر کہا لڑکے نے حضرت آپ تو بڈھے ہوئے
اور کل خوشیاں جوانی تک ہیں ساتھ انسان کے

ہیں بڑھاپے میں کہاں پایا! جوانی کے مزے
آپ کو کچھ غم جوانی کا نہیں پھر کس لیے؟
مہربانی سے مجھے اس کا سبب دیجئے بتا
باپ نے یہ سُن کے لڑکے سے کہا" اے میری جاں"
یہ تمہارا باپ بڈھا جن دنوں میں تھا جواں
تھا جوانی کو سمجھتا اپنے گھر کی میہماں
اس لئے ہر بات میں رکھتا تھا آئندہ کا دھیاں
پھر بڑھاپے میں جوانی کا مجھے غم ہو تو کیا!
عرض کی لڑکے نے چھایا اب بڑھاپا آپ پر
اور چلی جاتی ہے گذری عمر جلدی کس قدر!
آپ لیکن اب بھی خوش ہی آتے ہیں ہردم نظر
موت کا بھی ذکر کرتے آپ ہیں ہو کر نڈر
مہربانی سے مجھے اس کا سبب دیجئے بتا
باپ بولا: ہاں! خوشی ہر وقت ہے بیٹا مجھے
اور سُن! معلوم ہے جو کچھ سبب اس کا مجھے
یاد جب ہردم جوانی میں خدا آیا مجھے
اس لئے وہ بھی بڑھاپے میں نہیں بھولا مجھے
پھر بڑھاپے میں جوانی کا مجھے غم ہو تو کیا!

وِدیا پرشاد فدا

انجام بخیر ہوگا

تاریک ہے راہ اور دشوار — وہ عرش پہ دیکھ حق مکیں ہے
کیا تو ہے شکستہ، چور، بیمار — کیا تیرا کفیل وہ نہیں ہے
مٹ جائے گا منزلوں کا خطرہ
جوڑے گا خدا دلِ شکستہ
انجام بخیر ہوگا ہر کام — ہر کام بخیر ہوگا انجام

طاقت سے بعید بار ہے کیا؟ — وہ عرش پہ دیکھ حق مکیں ہے
دل یاس سے بے قرار ہے کیا؟ — کیا تیرا کفیل وہ نہیں ہے
ہو جائے گا بوجھ بٹ کے ہلکا
ٹھیکہ نہیں آج اور کل کا
انجام بخیر ہوگا ہر کام — ہر کام بخیر ہوگا انجام

روپوش ہے تجھ سے روشنی کیا؟ وہ عرش پہ دیکھ حق مکیں ہے
دن رات ہے دل میں سنسنی کیا؟ کیا تیرا کفیل وہ نہیں ہے
بازو ہیں محیط اس کے ہرسو
تھا اس کا کرم کہ بچ گیا تو
انجام بخیر ہوگا ہر کام ہر کام بخیر ہوگا انجام

تیرہ ہے الم سے عاقبت کیا؟ وہ عرش پہ دیکھ حق مکیں ہے!
کیا ایسی مہیب شے ہے "فردا" کیا تیرا کفیل وہ نہیں ہے
ہے جنبش برگ سے وہ آگاہ
بخشندہ ہے سب کا وہ شہنشاہ
انجام بخیر ہوگا ہر کام ہر کام بخیر ہوگا انجام

رسالہ "زمانہ" کانپور جولائی ۱۹۲۱ء

غلام محمد طور

نوحۂ محبت

تجھے کیا ہوا ہوئی کیا تری وہ وفا شعاری   کبھی جس سے بہرہ ور تھا
ترے دل سے سنگ دل تھی کبھی جو مہر جاری   کبھی جس سے پُر ثمر تھا
مرا نخلِ زندگانی

تجھے کیا ہوا ہوئی کیا تری ہائے وہ محبت   مٹی تیرے دل سے یکسر
جو مجاز تھی بظاہر جو دراصل تھی حقیقت   کروں کس طرح سے باور
کہ یہ شے نہیں تھی فانی

تجھے کیا ہوا ہوئیں کیا تری دلنوازیاں وہ   مری جاں وہ دن بھی کیا تھا
تری غمگساریاں وہ تری چارہ سازیاں وہ   کہ تو مجھ پہ خود فدا تھا
ہوئی کیا وہ خوش گمانی

تجھے کیا ہوا ہوئی کیا ترے دل کی وہ صفائی   ترا سینہ آئینہ تھا
تھا جھلک سے جس کی خیرہ کبھی دیدہ خدائی   کبھی صدق اور صفا تھا
جو ہیں آج آنجہانی

تجھے کیا ہوا کیا وہ زمانِ مہر و اُلفت
مرا دل تھا بے کدورت
تجھے حسن سے تھی غفلت مجھے عشق سے جہالت
تری صاف تھی طبیعت
تھی کہاں یہ سرگرانی

تجھے کیا ہوا ہوئی کیا تری وہ حیا پسندی
ترا حُسن عشق میرا
کہ ابھی نہ شوخیاں تھیں ترے طفل دل نے سیکھی
ابھی تھا وہ سیدھا سادا
یہ تھی مختصر کہانی

تجھے کیا ہوا کیا ترا لُطف ابتدائی
نہ حسن تھا اکیلا
تھی روش ستمگری کی تجھے جب تلک نہ آئی
نہ جفا کا تھا رسالا
یہ لباس ارغوانی

تجھے کیا ہوا خدا را نہ چھپا رخ درخشاں
وہی عادی تماشا
مرا دیدہ طالب تھا شب و روز جو کہ حیراں
وہی خوگر نظارا
کرے آج خونفشانی

تجھے کیا ہوا نگاہیں پھری کیوں وہ دلبرانہ
وہی مشعل محبت
پلا جن کی گودیوں میں مرا ذوق شاعرانہ
وہی شمع بزم اُلفت
وہ چراغ لامکانی

تجھے کیا ہوا ہوا کیا وہ تبسم فراواں
مرا دل تھا جس سے شاداں
مرے چہرۂ فسردہ پہ تھا جس کا عکس رقصاں
تھا خوشی سے دست و داماں
نہ تھی سوزش نہانی

تجھے کیا ہوا ہو نہیں کیا تری پیاری پیاری باتیں ترا مجھ سے وہ لپٹنا
مجھے یاد ہو ہو نہیں مری جان وہ ساری باتیں مرا تجھ سے پیار کرنا

بہ کمال جانفشانی

تجھے کیا ہوا ہوئی وہ ترے دل کی کیفیت کیا کبھی میں جو تجھ سے روٹھا
کہ مرے بغیر تجھ کو کبھی چین تھا نہ آتا مجھے تو نے آ منایا

بزبان بے زبانی

تجھے کیا ہوا ہوا کیا وہ زمانہ فراغت وہ پیاری ہم نشینی
کہ میں جس کو رو رہا ہوں وہی روزگار عشرت گل رخ کی بوسہ چینی

ہوئی کیا وہ زندگانی

تجھے کیا ہوا ہوا کیا ترا جذبہ محبت میں مروں گا بے اجل کیا
کہ سکوں نے آج تجھ پہ ہے اٹھا رکھی قیامت ہے یہی وفا کا ثمرہ

مرے او جفا کے بانی

حسُن اصلی

گل عارض پہ جن کے مائل ہیں
لعل لب پر ہے جن کے دل شیدا
تیغ ابرو کے جن کی گھائل ہیں
چشم نرگس سے جن کی ہے سکتہ

ایک مدت گزرنے پر ان کا
جب بکھر جاتا ہے یہ شیرازہ
جوت ہوتی ہے لعل لب کی کم
گل عارض بھی جاتے ہیں کمہلا

چشمِ فتاں میں وہ لگاوٹ پھر
نہیں رہتی ہے نام کو اصلا
حسن اصلی ہے صاف دل ہونا
صاف سینہ ہو آئینہ جیسا

دل میں اُلفت کی شمع روشن ہو
پرتو افگن ہو نیکیوں کی ضیا

نیک سیرت ہو نیک خصلت ہو
نہ سہی ہو نہ صورت زیبا

جمع باتیں یہ جس کی ذات میں ہوں
ہے وہ بے مثل حُسن میں یکتا

گلِ رُخسار و لعلِ لب کی اُسے
نرگسِ چشم کی نہیں پروا

حُسن میں بس وہی ہے لاثانی
موردِ فضل و لُطف رحمانی

رسالہ "زمانہ" کانپور جنوری ۱۹۲۷ء

فضل الرحمٰن

تسلّی

جہاں کی آنکھوں میں ذلت پہ ذلت جب اٹھاتا ہوں
الگ دُنیا سے تنہائی میں جب آنسو بہاتا ہوں
فلک کے کان بہرے کرتا ہے شور بکا جس دم
نصیب دشمناں دیتا ہوں خود کو بددعا جس دم
دل مضطر کو تڑپاتی ہے ارمانوں کی جب کثرت
تمنا حُسن کی گاہے کبھی احباب کی حسرت
عبث ہر شخص کی شام و سحر پر رشک آتا ہے
کمال اِس کا تو مال اُس کا حسد سے جی جلاتا ہے
مشاغل اپنے بھاتے ہیں نہ فرصت اپنی بھاتی ہے
غرض مجھ کو خود اپنی زندگی سے شرم آتی ہے
تری یاد آتی ہے ایسے میں صبح نغمہ خواں بن کر
تری اُلفت صدا دیتی ہے پیک آسماں بن کر
عطا کرتی ہے وہ دولت نہیں حاصل جو شاہوں کو
مسرت وہ کہ جس پر رشک آئے کج کلاہوں کو

انگلش اردو ٹیچرس اورینٹ ۱۱ ایگزیبیشن ۱۹۶۱ء

سید راحت حسین

راز کامیابی

اک خسرو دلاور عقل اپنی کھو رہا تھا
جنگ آزمائیوں میں ناکام ہو رہا تھا
سر پر تھا تاج زریں دل میں تھا غم کا طوفاں
بستر پہ پڑ گیا وہ جی ہار کر پریشاں

کار اہم کا سودا سر میں وہ تھا سمایا
اک دھوم فتح کی ہو خوش حال ہو رعایا
تدبیریں کیں ہزاروں لیکن نہ کچھ بن آئی
درد و الم سے دل پر افسردگی سی چھائی

ڈوبا تھا رنج و غم میں مایوس چپ پڑا تھا
درد نہاں کی زندہ تصویر تھا سراپا

تھا فکر میں کروں کیا کیوں کر مہم یہ سر ہو
دل نے کہا ہٹاؤ ممکن نہیں کہ در ہو

عزم جدل سے جس دم باز آیا وہ دلاور
ناگاہ ایک مکڑی چھت سے گری زمیں پر
باریک سوت کی ایک انٹی چھپا کے لائی
تار شعاعی منہ سے اپنے اگلتی آئی

جالا وہ تن رہی تھی سقف محل میں پنہاں
سطح زمیں تک آئی گرتی ہوئی ہراساں
آئی نظر جو اس کو افتاد حیرت افزا
سوچا کہ دیکھوں مکڑی کرتی ہے کیا تماشا

مشکل تھی راہ اس کی سیدھی فضا میں اُوپر
تار نظر سے بڑھ کر باریک اور بریک تر
جانا تھا دور اس کو رکھتی تھی عزم گھر کا
پکڑے ہوئے تھی محکم باریک سوت اپنا

آیا نہ یہ سمجھ میں اس خسروِ جہاں کے
جائے گی گھر کو واپس وہ کس طرح یہاں سے
حبِ وطن تھی شامل مکڑی کے آب و گل میں
تھا جوش ولولوں کا اتنے سے ایک دل میں

لو اڑ رینگتی چلی وہ اونچی ہوئی فضا میں
تارِ نشاں سے لپٹی لٹکی ہوئی ہوا میں
وہ چھوٹ کر وہاں سے گرتی چلی زمیں پر
آئی سرکتی نیچے جس جا تھی پھر وہیں پر

دم لیکے دوڑی سیدھی پھر خطِ زرفشاں پر
گرنے کا اپنے شکوہ لائی نہ وہ زباں پر
اُوپر گئی ہوا میں اتنا کہ پھر گری وہ
تیورا کے کوئی ساعت بے دم پڑی رہی وہ

آیا جو ہوش اس کو دیوانہ وار دوڑی
جھکتی سنبھلتی رکتی با حالِ زار دوڑی
پوشیدہ دل میں اس کے تھا رازِ بے قراری
دو ہاتھ اور اونچی مکڑی گئی تمہاری

وہ اضطراب اس کا وہ سوز دل کا انداز
آئی زمیں کی جانب گرتی ہوئی فسوں ساز
پھر جھومتی چلی وہ جانبازیاں دکھاتی
خلوت کو اپنے تکتی لہراتی تلملاتی

جاکر فضا میں اُونچی خم کھا کے پھر جھکی وہ
ٹھہری نہ ایک لمحہ پھر دوڑی پھر گری وہ
خائف ہوئی نہ دل میں گو منہ کی اپنے کھائی
تھا جوش ولولوں کا یا جذب کہربائی

چھ بار گرتی آئی اس طرح جب فضا میں
اور جذب مرکزی سے حیراں ہوئی وغا میں
پکڑی زمین اس نے سمجھا یہ شاہ ذی جاہ
جہاں ہے کوئی دم کی مرجائیگی یکہ ناگاہ

لے کر پھریری دوڑی اک بار پھر ہوا پر
ہمّت سے اپنی پہونچی جالے کے وہ قریں تر
اٹھ بیٹھا شاہ محزوں چلایا "ہاں خبردار۔
کیا وقت ہے یہ نازک اے ننھی جان بیزار"

ننھا سا جسم تولے جھولے پہ چرخ کھاتی
اوجِ ہوا پہ پہونچی وہ پینگ کو بڑھاتی
کرتب دکھا رہی تھی اک خطِ نقرئی پر
یا کھیلتی تھی پتلی تارِ نظر پہ بڑھ کر

اونچی ہوئی یہاں تک وہ رہروِ ہوائی
لے دیکھے رہ گئی بس اک ہاتھ اور چڑھائی
سنبھلی سنبھل کے تاکا ڈوری کو اک نظر میں
شوخی سے دوڑ کر پھر داخل ہوئی وہ گھر میں

اتنی سی جان اس کی وہ اس کا بول بالا
وہ ننھی ننھی آنکھیں وہ رنگ کالا کالا
ہر بار اس کا تکنا وہ فتح کی خوشی میں
وہ یاس سے ہراساں ہونا نہ اپنے جی میں

"شاباش و آفریں ہے!" چلا اٹھا شہنشاہ
"ہاری زمین تجھ سے بازی تو لے گئی واہ"
تصویر ہے مجسم تو غیرت و ہوا کی
ہمت کی ولولوں کی جذبات نہاں فزا کی

فطرت کی لاڈلی ہے محنت کی تو ہے عادی
غضب کی دل میں تو طاقت الادی
کیا میں نہ پاسکوں گا عزت جو تو نے پائی
لے فتح ہو مبارک علی تو نے رہنمائی

آمادہ کر کے دل کو ہشیار پھر ہوا وہ
دشمن پہ حملہ آور اک بار پھر ہوا وہ
تلواریں جگر کاٹیں بادل سی فوج چھائی
دریا بہا لہو کا ایسی ہوئی لڑائی

تھا شور الاماں کا اک حشر کا تھا عالم
غازی کھڑا تھا تنہا لہرا رہا تھا پرچم
دل میں جو بات ٹھانی آخر وہ کر دکھائی
تھا اس کو فتح کرنا یوں اس نے فتح پائی

لو ختم ہو چکی اب تم سن چکے کہانی
مانو تو اک نصیحت تم کو بھی ہے سکھانی
محنت سے پیارے لڑکو ہرگز نہ جی چرانا
تقدیر مسکرا کر گاتی ہے یہ ترانا

بیکار وقت کھونا گر خو رہی تمھاری
لائے گی رنگ اک دن تن پروری

"مجھ سے نہ ہو سکے گا" ہیں بزدلی کی باتیں
نادانی اور حماقت اور کاہلی کی گھاتیں

کار اہم کا کرنا آسان دل میں سمجھو
جانیں لڑا دو اپنی جب عزم دل میں کر لو

ہونا نہ تم ہراساں دشواریاں ہیں اول
اسرار فتح کی ہیں نامیاں ہراول

رسالہ زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۲۴ء

محمد سیف الدین شباب

شرح آرزو

کاش شوق دید تیرا پر لگا دیتا مجھے
مثل مرغان سحر پرواز میں کرتا ہوا
دیکھتا تجھ کو جھروکے سے ترے ایوان کے
آفتاب صبح کا ہونے سے پہلے سامنا
پھول کو خوشبوئی میں کرتی خجل دل کی کلی
گوندھتا اس کو جو تو اپنے گلے کے ہار میں
دلفریب اس سے دوبالا ہوتی اس کی سادگی
اور پیاری ہوتی کھلاتی جو تیرے پیار میں
کاش ہوتی میری ہستی موجہ باد صبا
ناز سے انداز سے اٹھکیلیوں سے چال سے
بوسہ لے لیتا تیری زلف اور تیرے رخسار کا
اور باہیں ڈال کر تجھ کو لگا لیتا گلے

زمانہ کانپور جولائی ۱۹۰۶ء

ضامن کنتوری

زندگی کا تھیٹر

دنیا کا تماشہ گاہ ہے انساں تماشہ گر
کرتا ہے سات کھیل یہاں آ کے ہر بشر

اٹھتا ہے پہلا پردہ تو دایہ کی گود میں
اک طفل شیر خوار ہے آتا ہمیں نظر

روتا ہے جو کبھی کبھی ہنستا ہے خود بخود
ہے رنگ فطرت اس کی اداؤں سے جلوہ گر

آتا ہے پھر کے طفل دبستاں کا روپ پھر
بستہ بغل میں رخ پہ چمک اور دل میں شر

جاتا ہے مدرسہ کو مگر رینگتا ہوا
مصداق ہے جو قول برندش کا سربسر

پھر دیکھئے تو آئے گا عاشق کے بھیس میں
آہیں لبوں پہ ہاتھوں سے تھامے ہوئے جگر

دل میں کوئی خیال نہیں جز خیال یار
شعار سوز و درد کے ہر دم زبان پر
پھر او بچی بنا ہوا داڑھی چڑھی ہوئی
لڑنے کو شیر سے ہے مہیا کسے کمر
ابرو پہ بل نظر غضب آلود دل میں جوش
آمادہ چھیڑ کرنے کو ہے بات بات پر
سر میں ہوا بھری ہوئی نام و نمود کی
تیار منہ میں توپ کے گھسنے کو بے خطر
پھر اس کے بعد آپ عدالت پناہ ہیں
وہ توند اور وہ جبہ و عمامہ و کمر
داڑھی نکیلی اور ہیں مونچھیں جھکی ہوئی
آنکھوں میں نور معدلت و عقل جلوہ گر
پردہ چھٹا جب اٹھتا ہے ہوتی ہے تب یہ شان
ڈھیلا لباس آنکھوں پہ عینک جھکی کمر
جرابیں نوجوانی کی ان سوکھی ٹانگوں کو
ہیں وسعت جہاں سے بھی گویا فراخ تر
مردانہ وہ صدا جو ہلاتی تھی دل کبھی
رکھتی ہے آج گریہ اطفال کا اثر
وہ کھیل جس کے بعد گرے گا ڈراپ سین
وہ کھیل جس کے بعد ہے پھر قصہ مختصر

عہدِ طفولیّت کا وہ ہوتا ہے یادگار
جس میں دوبارہ ہوتا ہے بے بال و پر بشر
تصویرِ بے ثباتیِ دُنیا کی ہے وہ کھیل
بے اختیار ہوتا ہے دل جس کو دیکھ کر
دنداں و گوش و چشم ہی جب ساتھ چھوڑ دیں
پھر خاک غیرِ مرگ تمنا کرے بشر

محمد عباس کاظمی نیشاپوری

پاک باطن

وہ جو رکھتا ہے اپنا باطن پاک
دہر کی آفتوں سے کیا اسے پاک

کبر و نخوت نہیں ہے جس دل میں
اس کو آسانیاں ہیں مشکل میں

جس کو ممکن ہے پر سکوں فضا
زندگی اس کی بس ہے بیش بہا

اس کا رہتا ہے ایک ہی عالم
نہ خوشی کی خوشی نہ رنج کا غم

صاف دل ہے مثال آئینہ
نہیں رکھتا کدورت و کینہ

جس کے دل میں ہے الفتوں کا گذر
بجلیوں کا اُسے نہیں کچھ ڈر

دل جو خوگر ہے برق و باراں کا
کیا اسے غم ہو جوشِ طوفاں کا
مسکراتا ہے دردِ فرقت میں
صبر کرتا ہے ہر مصیبت میں
نیک کاموں سے ہے فقط اسے کام
اس کا آغاز ایک، اک انجام
رہ کے دُنیا میں ناتوانوں کی
سیر کرتا ہے آسمانوں کی
ہو گیا جو کہ فتنوں سے دُور
وہی دل تو ہے جلوہ گاہِ طور
اس کو ہر غم سے مل گئی فرصت
اس کی دُنیا ہے رشکِ جنت

بہار انگلستان ۔ سرفراز قومی پریس ۱۹۷۰ء

عبدالرحمٰن غازی

عاشق فطرت کا ترانہ

دل اچھلتا ہے مرا قوسِ وقزح کو دیکھ کر
یاد آجاتی ہے ایامِ کہن کی داستاں
کیفیت اس کی یہی تھی عہد طفلی میں مرے
اور جوانی میں مرے اس کا ہے ویسا ہی سماں

اب یہ خواہش ہے کہ گو ہو جاؤں پیری کا اسیر
پر مٹے اُلفت کا لذت آشنا یہ دل رہے
ورنہ گر یہ روح فطرت کر گئی پرواز تو
کس لئے یہ جسم پھر مربوط آب و گل رہے

طفلِ ناداں درحقیقت آدمی کی اصل ہے
اس کے ہر اک فعل سے حیوانی فطرت ہے عیاں
اس تنِ خاکی میں جن جذبات کا ہوگا کمال
ہم کو مل جاتا ہے ان کا شیر خواری میں نشاں

آرزو ہے خواہ باقی زندگی کیسے کٹے
کامرانی سے رہوں یا رہینِ نومیدی رہوں
ہاں مگر جب تک رہوں دُنیا میں پابندِ حیات
زُلفِ فطرت کے مسلسل عشق کا قیدی رہوں

رسالہ زمانہ کانپور جون ۱۹۱۸ء

فضل الرحمن

جامِ فنا

جب کلیسا کا جرس ہو نوحہ خواں میرے لئے
مت پہن تو ماتمی پوشاک اے جاں میرے لئے
جب چلا جاؤں میں دُنیائے حزیں کو چھوڑ کر
قبر کے کیڑوں میں بیچ اہل زمیں کو چھوڑ کر
ذکر میرا دل ترا کر دے نہ غمگیں بھول جا
بھُول جا مجھ کو، مرے نغماتِ شیریں بھول جا
بعد میرے کر نہ پیارے بھول کر بھی مجھ کو یاد
لوحِ خاطر سے مٹا دے داغِ عشقِ نامراد
خاک میں تربت کی جب مل جائے یہ مشتِ غبار
تیرے ہاتھ آئے کبھی گر میری نظمِ دل فگار
لے نہ ہرگز تو کفِ افسوس مل کر میرا نام
میرے دم کے ساتھ کر دے قصۂ اُلفت تمام
لوگ ورنہ موردِ الزام کر دیں گے تجھے
تیرے نالے خلق میں بدنام کر دیں گے تجھے

انگلش اردو ٹیچرس اورینٹل میگزین ۱۹۲۱ء

محی الدّین

ہوشیار لڑکا

حامد ایک ہوشیار لڑکا تھا — عمر میں گرچہ دس برس کا تھا
حامد کو جو تھی بہن چھوٹی — تنگ کرنے کی بات اسے سُوجھی
گھر میں آئے کہیں سے لڈو دو — پاس لے کے بہن کے پہنچا جو
ننھی! دیکھو یہ ہاتھ میں میرے — تین لڈو ہیں خوشنما کیسے
حامدہ بولی پیارے بھائی جان — دو ہی لڈو ہیں صرف تین کہاں؟
بولا حامد کہ تم تو بچی ہو — عقل کی تم ہنوز کچی ہو
دو نہیں تین لڈو رکھتا ہوں — تم پہ ثابت کئے یہ دیتا ہوں
ایک ہے داہنے ہاتھ میں دیکھو — ہاتھ میں بائیں جو ہے دو سمجھو
ایک میں دو اگر جمع کر دیں — کیوں نہ پھر تین ان کو ہم سمجھیں

ننھی لڑکی نہ پیچ یہ سمجھی — بلبلا کر وہ اب تو رونے لگی
اُس کی آواز باپ نے جو سنی — آگیا وجہ پوچھنے اس کی

حامد آنے پہ اس کے خوب ہنسا / ماجرا پھر بیان کیا سارا
بیٹا شاباش سچ ہے کہتا تو / شک نہیں اس میں تین ہیں لڈو

حامد کو میں ایک دیتا ہوں / دوسرا اپنا آپ لیتا ہوں
تیسرا پاس ہے تمہارے جو / شوق سے کھاؤ یا اسے رکھو

سیفرؔ کاکوروی

اشکِ آصف

زمانے میں کہاں ایسی دلاویز نسیم عطر آگیں اور سحر خیز
کہاں ابر بہاری یوں گہر بیز کہاں قلب پر ارمان و طرب ریز
نہ ایسے اشک چشم سرمگیں ہیں
نہ ایسے دُرِّ ناسفتہ کہیں ہیں

جمال حور طلعت ہے سمندر کہاں یہ آب یہ ماہ ستمبر
بپا ہے ہر طرف گو شور محشر سحاب مرحمت ہے سایہ گستر
سراسیمہ تھی گو ساری رعایا
سروں پر چھا گیا شفقت کا سایہ

کرم فرما ہوئے جب خود بدولت لبوں پر تھی دعا آنکھوں میں رقت
نظر آئے جو شہ کے اشکِ حسرت نہ ہونگے محو دل سے تاقیامت
فلک کھایا کرے دن رات چکر
رہے گا اسمِ اعظم نقش دل پر

ہیں اب تک وہ درِ شہوار باقی ہے شور ابر گوہر بار باقی

ہے سودائے درِ خمار باقی ابھی ہے نکہت گلزار باقی

دگرگوں لاکھ دورِ آسماں ہے

دلوں پر سکّۂ آصف رواں ہے

رسالہ "زمانہ" کانپور اگست ۱۹۱۲ء

نظم طباطبائی

دعوت زہرہ

اے زہرہ خال رُخ گردوں — ہیں جس کے معبد خلد نموں
ہے تیرا تبسم ایک افسوں — انداز ترا اُلفت کا شگوں
اے زہرہ میرے دل سے نکال
اس عشق کا درد انگیز خیال

دی پہلے بھی تو نے داد مری — اور دل سی سنی فریاد مری
ایذائے دل ناشاد مری — کر اب کے بھی امداد مری
گردوں سے مدد کرنے کو اتر
پھر ناز و ادا سے ہو جلوہ گر

تو پردۂ قدرت سے نکلی — اور طے کئے سب برج فلکی
پریوں سے اڑایا تخت شہی — اللہ ری سبک پروازان کی
آپہنچیں مرے کاشانہ تلک
اور دیکھ لی میں نے پروں کی جھلک

تو تخت سے اتری خندہ جبیں　　وہ خالی تخت کو لے کے پھریں
کی مجھ پہ نگاہ لطف آگیں　　اور ہنس کے کہا، تو کیوں ہے حزیں

کچھ تازہ شکایت ہے تجھ کو
پھر میری ضرورت ہے تجھ کو

کہہ، سر میں ترے کیا سودا ہے　　اور اس کا علاج آخر کیا ہے
وہ کون جوانِ رعنا ہے　　تو جس کی والہ و شیدا ہے

کس نے ترے دل کو موہ لیا
کیا ہو گیا سیفو حال ترا

گو آج نہیں اس کو رغبت　　کل خود وہ جتائے گا چاہت
گو آج وہ کرتا ہے نفرت　　کل ہو گا اسیر غم و حسرت

مارے گا اسے انداز ترا
ہو جائے گا کشتۂ ناز ترا

اے زہرۂ رخشندہ پیکر　　پھر چاہتی ہوں میں کرم کی نظر
یہ مشکل میری آساں کر　　لے سوز جگر کی میرے خبر

اے دینے والی مرادوں کی
دے مجھ کو میری مراد دلی

محمد عباس کاظمی نیناپوری

آغوش فنا

گردش ایّام سے کیا ڈر تجھے
موت کے آغوش میں سوچین سے

دھوپ کی پروا نہ سردی کا خیال
رنج و راحت میں رہے گا ایک حال

جسم آغوش فنا میں کھو گیا
ختم تیرا کارنامہ ہو گیا

ماہ پیکر ہوں، کہ ہوں وہ مہ جبیں
آہ سب چھپ جائیں گے زیر زمیں

مال و دولت والے ہوں یا ہوں فقیر
موت کے پھندے میں سب ہوں گے اسیر

کر نہ پائے گا کوئی تجھ پر ستم
ظلم سے ظالم کے اب کیا تجھ کو غم

موت کا دروازہ جس دم کھل گیا
ہو گئے یکساں سبھی شاہ و گدا

علم و حکمت کے خزانے لُٹ گئے
شان و شوکت کے ذخیرے چھٹ گئے

آشیانہ ہٹ گیا جب باغ سے
بجلیوں کا پھر تجھے ڈر کیا رہے

جوش پر طوفاں ہے یا منجدھار ہے
اس کو کیا غم جس کا بیڑا پار ہے

نیک نامی ہو کہ بدنامی کا داغ
ایک دن حاصل سبھی سے ہے فراغ

چاہنے والے رہیں گے کچھ دنوں
صدمۂ دوری سہیں گے کچھ دنوں

رہ نہ پائیں گے مگر وہ بھی یہاں
چھوڑ جائیں گے محبت کے نشاں

غم نہ رہ جائے نہ رہ جائے خوشی
ہے محبت کا یہی انجام بھی

بہارِ انگلستان سرفراز قومی پریس ۱۹۷۰ء

فضل الرحمٰن

جین

دل کو بھلاتی ہے پچھم کی ہوا
میری پیاری کا مکاں ہے جس جا

بیچ میں ہیں کئی میداں حائل
کئی پربت کئی ندیاں حائل

دور رہ کر بھی ہوں جینی کے قریب
میرے بھاگ اچھے ہیں اچھے ہیں نصیب

یاد گالوں کی دلاتے ہیں گلاب
نرگس ان آنکھوں کا دکھلاتی ہے خواب

ڈالی ڈالی پہ جو گاتے ہیں پرند
اس کی آواز سناتے ہیں پرند

گنگناتی ہے صبا اس کی طرح
راگ گاتی ہے ہوا اس کی طرح

چڑیوں کے چہچہوں میں اس کی صدا
پھولوں کے قہقہوں میں اس کی صدا

انگلش اردو پوئٹری اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

عبدالقیوم خاں باقی

فاؤسٹ

منظر اول

رات

میں ایک غم کدہ علم کے فشار میں ہوں
میں ایک نشۂ بے کیف کے شمار میں ہوں

پئے ہیں علم کے پیمانہ ہائے زریں نے
خرام ہوش کی دیکھی ہے رہ گذریں نے

ملی ہیں فلسفہ وطب کی دولتیں مجھ کو
ملی ہیں مذہب وحکمت کی نعمتیں مجھ کو

اصول وضع قوانین میں نے سیکھے ہیں
نجوم کے بھی مضامین میں نے سیکھے ہیں

مگر ملا ہے ریاضت کا یہ ثمر مجھ کو
حقیقت ایک بھی آتی نہیں نظر مجھ کو

ہیں فتنہ کاری شیطان سے بے خبر ہوں مدام
صدائے حشر ہے مجھ کو صدائے بے ہنگام

مرے نصیب میں لیکن خوشی کا نام نہیں
مری حیات میں عشرت کا انتظام نہیں

نہ قدردانی عالم ہے اور نہ سلطانی
نہ جاہ و شوکت و اقبال کی فراوانی

نہ مال و زر ہے مرے پاس اور نہ ہے ناموس
جلا رہا ہوں فقط اک خیال کا فانوس

اسی لئے مری خواہش ہے ساحری سیکھوں
یہودیوں کی طرح سحر ساحری سیکھوں

حجاب گردش عالم کو آشکار کروں
شکار جس کا رہا ہوں اسے شکار کروں

یہ کم سوادی لفظ و خیال مٹ جائے
امید و یاس عروج و زوال مٹ جائے

کرے گرانی عالم نہ دل فگار مجھے
حیات دہر پہ حاصل ہو اختیار مجھے

(اسکی نظر چاند پر پڑتی ہے جو اس وقت کھڑکی کے سامنے نظر آرہا ہے)

ہے روشنی تری اے چاند میری دُنیا پر
مری نگاہ، مرے دل، مری تمنّا پر

ترے فروغ سے لب جھلملا رہا ہوں میں
ترے خیال کا پردہ ہلا رہا ہوں میں

وہی ہے تو کہ تری نور پاشیاں ہر بار
مری نگاہ میں تھیں ایک نشۂ بیدار

میں اپنی میز پہ کھڑکی سے دیکھتا تھا تجھے
فروغ نیم شب علم تھے ترے جلوے

ہے یاد وہ ترا بامِ فلک پہ چڑھ جانا
مری کتاب پہ باران نور برسانا

شعاع نور سے کرنا وہ شاد شاد مجھے
رہے گا اے مہ کامل ہمیشہ یاد مجھے

مجھے نصیب ہوں اے کاش رفعتیں تری!
مرے خیال پہ نازل ہوں برکتیں تری!

پناہ لے کے تری روشنی کے دامن میں
پہنچ سکوں سر کہسار اک نشیمن میں

تری نظر سے ہو پرواز کوہساروں پر
میں تیرے نرگوں روحوں کے ساتھ غاروں پر

سحر کو شبنم عرفاں کی دے کے آب و تاب
تو مری روح کو دے غسلِ نور اے مہتاب

ضیائے ماہ کی رخشندہ برکتیں دیکھو
فروغِ حسن کی آسودہ رحمتیں دیکھو

شعاعِ فیضِ ازل چھن رہی ہے شیشے میں
جھلک رہی ہے مئے حُسن آبگینے میں

ہزار حیف کہ اس وقت مدہوش ہے تو
یہ چاندنی کا سماں اور بے خروش ہے تو

میرے کمرہ کو دیکھو۔ کرم خوردہ کتابوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ چھت کتنی بوسیدہ ہے دیوار کی تاریکیاں کتنے چراغوں کے جلنے اور کتنی راتیں کالی ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔ یہ ہے میری دُنیا۔ یہ ہے میرا خانہ تاریک۔

اے چاند مجھ سے پوچھ کہ دلگیر کیوں ہوں میں
اُمید و انتظار کی تصویر کیوں ہوں میں؟

آتیں کہاں سے نبض رواں ہیں یہ سردیاں
ہائے خیال کرتا ہے کیا رہ نوردیاں؟

عشرت کی گود میں ہے مرا قلب سوگوار
کس پیکرِ حسین کا ہے مجھ کو انتظار؟

اپنے آپ سے

اے نارسائے عقل و خرد، ہے نری خطا
رہتا ہے فکرِ عالمِ خاکی میں مبتلا

صنعِ خدا کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے بشر
تو، اور ایک خاک کی دُنیا میں جلوہ گر

تو اور ہو اسیرِ صنم خانۂ خیال
ہر عروجِ چرخِ بریں تجھ کو یہ زوال؟

لہریں ہوں خون میں دُنیا کے زہر کی
تو بیڑیوں میں دفن ہو خونخوار دہر کی

اٹھ اور ایک عالمِ بے جہت میں نکل
اک دشتِ بے کنار میں دیوانہ وار چل

اس سحرِ کامیاب کی لے ہاتھ میں کتاب
جادوگری کے دشت میں چل اور چل شتاب

اس رہبرِ قوی کا عصا جلد تھام لے
اے پیکرِ ضعیف ذرا دل سے کام لے

عرفان و انکشاف کی دولت ملے گی خود
تحقیقِ کائنات کی فرصت ملے گی خود

وا تجھ پہ ہونگے انجمِ تابان کے رازِ دل
نغمہ طراز ہوں گے ملائک کے سازِ دل

جن و پری کے شعبدے آئیں گے یاں نظر
ارواحِ غیب ہوں گی ترے آگے جلوہ گر

اے دستِ راز، چھیڑ کوئی سازِ زندگی
اے روحِ غیب ہاں کوئی آوازِ زندگی

حفیظ ہوشیارپوری

بچّے کے پاس خُدا کی دی ہوئی نعمتیں

دو آنکھیں ننھی ننھی ہیں روشن اور دمان جو دیکھتی ہیں
دور اور نزدیک کی چیزوں کو پھولوں کو اور درختوں کو
آکاش کی نیلی چھت کے تلے
سب اُڑنے والے پرندوں کو
دو کان بھی ہیں جو سُنتے ہیں سب اچھی اچھی آوازیں!!
جب امّاں جان بُلاتی ہیں آواز کو یہ سُن لیتے ہیں
کیا پیارے پیارے لفظوں میں کرتی ہیں نصیحت یہ مجھ کو
"سن دل کے کان سے لال مرے
ہو نیک خصال زمانے میں"
ایک چھوٹا سا منہ جو رکھتا ہوں اور اس سے کام جو لیتا ہوں
خود میں ہی اس کو جانتا ہوں کرتا ہوں سارا دن باتیں
اور جو کچھ دل میں آتا ہے سب فوراً ہی کہہ دیتا ہوں

دو ننھے ننھے ہاتھ بھی ہیں — چیزوں کو جن سے پکڑتا ہوں
یہ دایاں ہے وہ بایاں ہے — پانچ انگلیاں بھی ہر ایک میں ہیں
میں ان کی مدد سے چیزوں کو — چھوتا ہوں اور پکڑتا ہوں
جس وقت بڑا ہو جاؤں گا — میرے یہ کام کریں گے سب
دو چھوٹے چھوٹے پاؤں ہیں — وہ حکم پہ میرے چلتے ہیں
میں ان کی مدد سے چلتا ہوں — جب چاہا کھڑا ہو جاتا ہوں
جب چاہا اچھلتا کودتا ہوں — اور جب کبھی ٹھوکر کھاتا ہوں
فوراً ہی کھڑا ہو جاتا ہوں — ویسے ہی اچھلتا کودتا ہوں
جس وقت تمہاری عمر کو میں — پہنچوں گا دیکھنا تم مجھ کو
مردانہ وار زمانے میں — بڑھ بڑھ کر قدم اٹھاؤں گا
بڑھ بڑھ کر قدم اٹھاؤں گا

تلوک چند محروم

ایامِ غم

سرد ہے دن، تیرہ و تاریک ہے اور خوفناک
مینہ برستا ہے، ہوا نے تیز ہے گرمِ سفر
اب تلک گرتی ہوئی دیوار سے لپٹا ہے تاک
جھونکے جھونکے سے ہیں گرتے خشک پتے خاک پر
اور دن ہے تیرہ و تاریک و سرد و خوفناک

زندگی میری بھی ہے تاریک و سرد و خوفناک
بارشِ اشک رواں ہے، صرصرِ آہ سحر
عہدِ ماضی سے مرے جذبات ہیں لپٹے ہوئے
اور جوانی کی امنگیں گر رہی ہیں خاک پر
آہ یہ ایام ہیں تاریک و سرد و خوفناک

مہرباں میرا۔ دلِ مغموم۔ بے جا شکوہ ہے
ابر کے پیچھے ابھی تاباں ہے مہرِ تابناک
ساری دنیا کی یہی قسمت ہے کیا شکوہ ہے
زندگی ہر شخص کی رکھتی ہے یاں بیم ہلاک
سب کے کچھ ایام ہیں تاریک و سرد و خوفناک

فضلُ الرحمن

بلبُل

ساون کا مہینہ تھا	خوشبوں کا خزینہ تھا
اک گوشۂ گلشن میں	مہندی کے حسیں بن میں
آواز چرندوں کی	چہکار پرندوں کی
کچھ جھنڈ درختوں کے	کچھ نرم و سبک پودے
دلشاد تھی خلقت کل	جز جان و دل بلبُل
وہ ایک حزیں خاطر	نالوں سے الم ظاہر
کانٹوں کی خلش تن میں	زخموں کی تپش تن میں
دیتی تھی صدائے غم	کرتی تھی سدا ماتم
وہ آہ و بکا اس کی	پر درد نوا اس کی
مجھ کو بھی رلاتی تھی	غمناک بناتی تھی
سنتا تھا جو وہ ماتم	یاد آتا تھا اپنا غم
پھر میں نے کہا دل میں	گلزار کی محفل میں

اے بُلبل نالاں تو کیوں رہتی ہے حیراں تو
کون اب ترا ہمدم ہے دل کا ترے محرم ہے
کس واسطے یہ رونا رسوائے چمن ہونا
کیا فکر درختوں کو عاری ہیں خرد سے وہ
بے حس ہیں چرندے سب بے درد پرندے سب
اک دوست نہیں تیرا کیوں کوئی کرے پروا
خوشیوں کے ترانے ہیں یاں اور ہی گانے ہیں
ہم دونوں کو اس سے کیا اپنا ہے جُدا رستہ
آہل کے کریں زاری
آپس میں ہو غم خواری

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

حفیظ ہوشیارپوری

ایک لڑکے کا گیت

گہرے اور شفاف پانی کے جہاں تالاب ہیں
جن کی تہ میں مچھلیاں ہر وقت محوِ خواب ہیں
خواہ دریا کی طرف ہوں خواہ سوئے سبزہ زار
دوستوں کے ساتھ جاتا ہوں وہاں میں سیر کو

دیر تک چھوٹے پرندے گاتے رہتے ہیں جہاں
اور پھولوں سے لدی رہتی ہیں جس جا جھاڑیاں
چہچہاتے اور پھدکتے ہیں جہاں ننھے پرند
دوستوں کے ساتھ جاتا ہوں وہاں میں سیر کو

جب درانتی کی صدائیں کھیت سے ہوں آرہی
اور ڈھیروں میں پڑی ہو گھاس تازہ اور ہری
شہد کی مکھی کے پیچھے پیچھے جانے کے لئے
دوستوں کے ساتھ جاتا ہوں وہاں میں سیر کو
جس جگہ دریا کے ہیں ڈھلواں کنارے پر کھڑے
ڈالنے والی گھنی چھاؤں درخت اخروٹ کے
اور پھل اخروٹ کے گچھوں میں گرتے ہیں جہاں
دوستوں کے ساتھ جاتا ہوں وہاں میں سیر کو

دُنیا

دُنیا ہے وہ مکاں جو نہیں راحت آشنا
وہ گل ہے جس کو بوئے محبّت ملی نہیں

وہ دوست جس کے دل میں محبت نہیں ذرا
شیرینی جس میں کچھ بھی نہیں ہے وہ انگبیں

ہر شخص عمر بھر ہے یہاں غم میں مبتلا
محفوظ یاں نہیں کسی رہرو کا راستہ

ماں کی ہے گود آج تو مرقد کی گود کل
ملتا ہے آج جامۂ رنگیں تو کل کفن

گرم سخن کبھی تو کبھی ہے زبان شل
تن تخت پر کبھی کبھی تابوت میں ہے تن

رہتی نہیں یہ عمر رواں ایک حال پر
درپیش مہد سے ہے لب گور تک سفر

ہے ہم سفر کوئی نہ کوئی رہنما ہے اب
آتا ہے قبر تک ہی جو آتا بھی ہے کوئی

آنسو بہا کے سوئے مکاں لوٹتے ہیں سب
اب تیرگی ہے اور ہے تنہائی دائمی

لو اقبر تک بھی آتے نہیں اب تو اقربا
یکساں ہے حال مرقد میر و فقیر کا

رسالہ "زمانہ" کانپور اپریل ۱۹۲۷ء

تلوک چند محروم

حسرتِ پرواز

کاش کہ اُڑنے کو دو چھوٹے سے پر ہوتے مرے
اور اک ننھا سا ہوتا طائرِ پرواز میں
آپہنچتا اُڑ کے تیرے پاس او جانِ جہاں
ذوق و شوقِ وصل میں کرتا ہوا چہکار میں
آہ! لیکن یہ تصور اک خیالِ خام ہے
اور تڑپتا ہوں پڑا تنہا یہیں لاچار میں
نیند میں پیارے! مگر میری یونہی پرواز ہے
اور تیرے پاس ہوتا ہوں میں ہر شب خواب میں
تب تو گویا ایک عالم ہے مرے زیرِ نگیں
اور لاثانی ہوں میں حشمت میں رعب اور داب میں
صبح دم جب آنکھ کھلتی ہے وہی تنہائی ہے
دل کو پاتا ہوں اسی تشویش و پیچ و تاب میں

ہے ٹھہرنا نیند کا امر محال آئی گئی
بادشہ بھی دے نہیں سکتا اسے حکم قیام

اس لئے جاگ اٹھتا ہوں لاچار میں پیش از طلوع
نیند ہو جاتی ہے اس صورت میں گو میری حرام

محو ہوتا ہوں طلسم جانفزا میں بس کہ میں
بند کر لیتا ہوں آنکھیں دیکھنے کو خواب شام

فضل الرحمن

انتظار

جاگ شاہ شرق جاگ   کردے پھر سلگا کے آگ
روئے چرخ تیرہ دل   سرخیوں سے مشتعل
صبح کی دیوی یہاں   چھوڑ کر خواب گراں
اٹھے بستر سے شتاب   فرش پا برگ گلاب
بلبلیں خوشیاں منائیں   زندگی کے گیت گائیں
یہ زمیں پھر زندہ ہو   زندہ اور تابندہ ہو
طرۂ زر تار کو   کرنوں کے انوار کو
دہر میں پھیلا کے تو   خاک کو چمکا کے تو
تاج شاہانہ پہن   لعل و دردانہ پہن
شام غم کافور ہو   چار جانب نور ہو
دیکھوں وہ شکل سحر   جس کو ترسا عمر بھر
چرخ کو گر کد نہیں   بخت اگر اب بد نہیں

انگلش اردو پوئمس اورینٹ لانگمینس ۱۹۶۱ء

آئے وہ رشک نگار   جس پہ سیم و زر نثار
سیر گلشن کو وہ آئے   صبح کا رُخ جگمگائے
سُن لے میری داستاں   درد فرقت کا بیاں
شاہ خاور دیکھ ادھر   کب سے حیراں ہے نظر
شمع کرنوں کی جلا   مجھ کو وہ جلوہ دکھا
جس کی تابش سے کبھی   تجھ پہ طاری تھی غشی
جاگ اے روح چمن   پھولوں کا زیور پہن
لحن داؤدی سے سن   نقرئی نغموں کی دھن
دیکھ اے موج ہوا   صورت باد صبا
ہے جو زلفوں کی ہوس   سر بہ سر بن جا نفس
چھیڑ دل بھر کر اسے   کہتے ہیں دل برا سے
پھر فضا خاموش ہے   کہکشاں روپوش ہے
رتھ میں سورج دیوتا   کرتا ہے طے راستہ
زعفرانی دشت و در   گرد رہ نجم سحر
یوں گریزاں دیو شب   جیسے اک مست طرب
ڈر کے بھاگے شعلوں سے   آگ کے پرکالوں سے
باغوں کا رنگیں لباس   ابر کا زریں لباس
تھی یہ جا خار نظر
وہ یہاں ہوتی اگر

کتابیات

۱۔ جواہر منظوم ۔ منشی غلام مولیٰ رقلق میرٹھی، گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۸۶۷ء

۲۔ منتخب انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے ۔ بانکے بہاری لال

۳۔ نظم آزاد ۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۸۹۹ء

۴۔ کلیات اسمٰعیل میرٹھی

۵۔ ارمغان فرنگ ۔ ضامن کنتوری مطبع شمسی حیدرآباد ۱۹۰۱ء

۶۔ جذبات نادر ۔ مرتبہ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی

۷۔ دو آتشہ شیخ غلام محی الدین ۔ لاہور پرنٹنگ پریس ۱۹۲۴ء

۸۔ فرسٹ بک آف بینی ریڈنگ ۔ حافظ فیاض احمد انصاری ۱۹۲۵ء

۹۔ در ثمین ۔ سروجنی نائیڈو کی نظموں کے اردو ترجمے مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد ۱۹۲۷ء

۱۰۔ من کی بانسری ۔ مولوی محمد امیر اورنگ آبادی ۔

۱۱۔ کلام طور ۔ مولوی غلام محمد طور

۱۲۔ دو رنگی تحفہ ۔ شیخ غلام محی الدین ۔ گورنمنٹ کالج ہوشیارپور مشرقی کتب خانہ حویلی کابل مل ۱۹۳۰ء

۱۳ ۔ دوآتشہ ۔ لالہ وگیان چند گدھوک ایبٹ آباد

۱۴ ۔ سُریلے بول ۔ محمد عظمت اللہ خاں ۔ اردو اکیڈیمی سندھ کراچی ۱۹۵۹ء

۱۵ ۔ رنگ بست ۔ اثر لکھنوی

۱۶ ۔ گنج معانی ۔ مجموعہ کلام تلوک چند محروم

۱۷ ۔ قریہ ویراں ۔ سید راحت حسین کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور

۱۸ ۔ تین شاعر: میر تقی میر ۔ میرانیس ہوریس امتھ پر ایک تنقیدی نظر ۔ ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور صیفیہ اکیڈمی کراچی ۱۹۶۵

۱۹ ۔ فاوسٹ از گوئٹے ۔ منظوم ترجمہ زعبدالقیوم خاں باقی

۲۰ ۔ سرود بقایا خواب طفلی ۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور ۔ حالی روڈ علی گڑھ ۱۹۵۳ء

۲۱ ۔ ترانہ مغرب انگریزی کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ ۔ سید راحت حسین

۲۲ ۔ تار پیراہن ۔ مجموعہ کلام شان الحق حقی اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۔

۲۳ ۔ عکس خیال ۔ ارشد صدیقی ساگری مکتبہ دانش بھوپال اکتوبر ۱۹۵۷ء

۲۴ ۔ انگلش اردو پوئمس ۔ محمد فضل الرحمن اورینٹ لانگ مین ۱۹۶۱ء

۲۵ ۔ تجدید جنوں ۔ مرتبہ رابرٹ گنگولیٹ مترجمین جلیس عابدی مخمور سعیدی مکتبہ تحریک انصاری مارکیٹ دہلی ۱۹۶۱ء

۲۶ ۔ نسیم مغرب اے سی بہار انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۳ء

۲۷ ۔ سوگوار یاد لارڈ ٹینی سن کی نظم ان میموریم کا ۔ رحم علی الہاشمی انجمن ترقی اردو منظوم اردو ترجمہ ۱۹۶۴ء

۲۸ ۔ بہار انگلستان ۔ انگریزی شعراء کے کلام کا اردو منظوم ترجمہ

محمد عباس کاظمی نیشاپوری ۔ سرفراز قومی پریس ۔ ناداں محل روڈ لکھنو ۱۹۷۰ء

Saaz-e-Maghrib (Vol. IV)

CONTENTS

PREFACE

It is through translations that new ideas enter into a language and open up new avenues of expression. It is only through translations that poetic ideas put on a new garb, become common intellectual property, and contribute towards the evolution of world literature.

Poems from most of the major languages of the world have been translated into Urdu — more from some, less from others. English is one of those languages from which a large number of poems have been translated into Urdu. This book forms part of a massive project which aims at making available to the readers a selection of Urdu verse translations from other languages of the world.

The first five volumes of the set, devoted to select verse translations from the English language, would contain about 500 translations which are the results of the creative endeavours of some 150 Urdu poets. After taking a close look at the whole collection we can safely conclude that though, by and large, the artistic and literary level of the transiations is somewhat lower than that of the original Urdu poetry, there are also quite a number of highly successful translations, which can rightly be a matter of pride for any Urdu lover. However, there are quite a few good reasons for this unevenness of quality. Besides working within the restrictions of acceptable rhyme schemes which give a unique euphonic richness to

Urdu poetry, finding equivalent allusions in keeping with its literary ethos is also not easy.

These verse translations not oniy go a long way to prove the innate vitality of the Urdu !anguage and its suitability to express lyrical feelings and ideas, they also help us in better understanding the evolution of modern Urdu poetry and the way it has been influenced by numerous verse translations done by many able poets over a long period of time.

In fact, these verse translations, which are quite sizable in number, should be treated as a regular genre of literature. Unfortunately, so far they have not received the amount of attention and recognition which they deserve.

The tradition of Urdu verse translations is some 125 years old (while the tradition of Urdu ghazals goes back to about 400 years). During this period a large number of Urdu poets including such great figures as Mohd. Husain Azad, Maulana Hali, Ismail Meerathi, Nazm Taba Tabai, Brij Mohan Datatriya Kaifi, Suroor Jahanabadi, Zamin Kanturi, Dr. Mohd. Iqbal etc. have taken deep interest in this form of poetry and have contributed much towards the development of this genre, which, at one time, almost took the form of a literary movement. The pioneers were especially attracted by the works of the English Romantic Poets. However, their contemporaries, as well as those who followed them, have also translated from many other poets, and this activity continues.

It is regretted that the original for some translations could not be given. The main objective of this anthology

is to collect the many verse translations in Urdu, which so far have been lying scattered and to save them from the ravages of time, Had the aesthetic value of the translations been our sole criterion for selection, we believe, that instead of the 500 and odd translations included in the 5 volumes of Saaz–e–Maghrib, a much more rigorous selection of some 50–60 translations would have been presented, which, hopefully, might be done in the near future.

HASANUDDIN AHMED

April 1978.

C. 307. Curzan Road Apartments,
New Delhi–110001.

The Star

Twinkle, twinkle, little Star.
How I wonder what you are!
Up above the world so high,
Like a diamond in the sky.

When the blazing sun is gone,
When the nothing shines upon,
Then you show your little light
Twinkle, twinkle, all the night.

Then the traveller in the dark
Thanks you for your tiny spark;
He could not tell which way to go
If you did not twinkle so.

In the dark blue sky you keep,
And often through my curtains peep;
For you never shut your eyes,
Till the sun is in the sky.

As your bright and tiny spark
Lights the traveller in the dark;
Though I know not what you are,
Twinkle, twinkle, little Star.

ANN. TAYLOR.

The Quiet Life

Happy the man, whose wish and care
A few paternal acres bound,
Content to breathe his native air
In his own ground.

Whose herds with milk, whose fields with bread,
Whose flocks supply him with attire;
Whose trees in summer yield him shade,
In winter fire.

Blest, who can unconcern'dly find
Hours, days, and years slide soft away
In health of body, peace of mind,
Quiet by day,

Sound Sleep by night; study and ease
Together mix'd; sweet recreation,
And innocence, which most does please
With meditation.

Thus let me live, unseen, unknown;
Thus unlamented let me die;
Steal from the world, and nota stone
Tell where I lie.

A. POPE

Ecstasy

Heart, O my heart ! the springtime is waking
In meadow and grove.
Lo, the melliflous Koels are making
Their paeans of love.
Behold the bright rivers and rills in their glancing,
Melodious flight,
Behold how the sumptuous peacocks are dancing
In rhpthmic delight.
Shall we in the midst of life's exquisite chorus
Remember our grief,
O heart, when the rapturous season is o'er us
Of blossom and leaf ?
Their joy from the birds and the streams let us borrow,
O heart ! let us sing,
The years are before us for weeping and sorrow
To day it is spring !

On The Castle Chillon

ETERNAL Spirit of the chainless Mind !
Brightest in dungeons, Liberty, thou art–
For there the habitation is the heart–
The heart which love of Thee alone can bind;

And when thy sons to fetters are consign'd
To fetters, and the damp vault's dayless gloom,

Their country conquers with their martyrdom,
And Freedom's fame finds wings on every wind,

Chillon thy ! thy prison is a holy place
And thy sad floor an altar, for 'twas trod,
Until his very steps have left a trace

Worn, as if thy cold pavement were a sod,
By Bonnivard ! May none those marks efface !
For they appeal from tyranny to God.

LORD BYRON.

The Blind Men And The Elephant

It was six men of Indostan,
To learning much inclined,
Who went to see the Elephant
(Though all of them were blind),
That each by observation
Might satisfy his mind.

The First approached the Elephant,
And, happening to fall
Against his broad and sturdy side,
At once began to bawl :
God bless me ! But the Elephant
Is very like a wall ! '

The Second, feeling of the tusk,
Cried: 'Ho! what have we here
So very 'Round and smooth and sharp ?'
To me 'Tis mightly clear
This wounder of an Elephant
Is very like a spear !'

The Third approached the animal,
And happening to take
The squirming trunk within his hands,
Thus boldly up and spake :
'I see, 'Quote he,' The Elephant
Is very like a snake !

The fourth reached out his eager hand,
And felt about the knee;
'What most this wondrous beast is like
Is mighty plain,' Quoth he;
'T is clear enough the Elephant
Is very like a tree.

The fifth, who chanced to touch the ear,
Laid: 'E'en the blindest man
Can tell what this resembles most,
Deny the fact who can,
This marvel of an Elephant
Is very like a fan.

The Sixth no sooner had begun
Abount the best to grope,
Than seizing on the swinging tail
That feel within his scope,
I see, 'quote he 'the Elephant
Is very like a rope!

And so these men of Indostan
Disputed loud and long,
Each in his own opinion
Exceeding stiff and strong,
Though each was partly in the right
And all were in the wrong!

So oft in theologic wars
The disputants, I ween
Rail on in utter ignorance
Of what each other mean
And prote about are elephant
Not one of them has seen.

JOHN GODFREY SAXE

Memory

I am the blossom of a bygone spring
Pressed in the books of time, a lovely thing
The hunger of an infulfilled desire;
The ashes in the hearth of last years' fire.

I am the balm that softens all lifes' scars
The heights the depths, the aguish and the stars
Into my cooling dark your minutes cast,
I am the temple of the living past.

I am the days you enjoyed, the days you wept,
I am the vast vault of silence safely kept
I am your laughter, I your sobbing cry
The echo of a voice that cannot die.

I am the link that bridges night and dawn
I am the soul that lives when all is gone
The yesterday, when this today shall dwell
I am your life, your death, your heaven, your hell

I am memory.

Alexander's Feast
Or
The Power of Music

'T WAS at the royal feast for Persia won
By Philip's warlike son—
Aloft in awful state
The godlike hero sate
On his imperial throne;
His valiant peers were placed around,
Their brows with roses and with myrtles bound
(So should desert in arms be crown'd);

The lovely Thais by his side
Sate like a blooming eastern bride
In flower of youth and beauty's pride :—
Happy, hoppy, happy pair !
None but the brave
None but the brave
None but the brave deserves the fair !

Thimotheus placed on high
Amid the tuneful quire
With flying fingers touch'd the lyre :
The trembling notes ascend the sky
And heavenly joys inspire.
The song began from Jove
Who left his blissful seats above—
Such is the power of mighty love !

A dragon's fiery form belied the god;
Sublime on radiant spires he rode
When he to fair Olympia prest,
And while he sought her snowy breast,
Then round her slender waist he curl'd,
And stamp'd an image of himself, a sovereign
of the world.

—The listening crowd admire the lofty sound;
A present deity! they shout around :
A present deity! the vaulted roofs rebound :
With ravish'd ears
The monarch hears,
Assumes the god,
Affects to nod
And seems to shake the spheres:

The praise of Bacchus then the sweet musician
sung,
Of Bacchus ever fair and ever young :
The jolly god in triumph comes !
Sound the trumpets, beat the drums !
Flush'd with a purple grace
He shows his honest face :
Now give the hautboys breath; he comes, he
comes !

Bacchus, ever fair and young,
Drinking joys did first ordain;
Bacchus' blessings are a treasure,
Drinking is the soldier's pleasure;
Rich the treasure,
Sweet the pleasure,
Sweet is pleasure after pain.

Soothed with the sound, the king grew vain;
Fought all his battles o'er again,
And thrice he routed all his foes, and thrice he slew the slain.

The master saw the madness rise,
His glowing cheeks, his ardent eyes;
And while he Heaven and Earth defied
Changed his hand and check'd his pride.
He chose a mournful Muse
Soft pity to infuse :
He sung Darius great and good,
By too severe a fate
Fallen, fallen, fallen, fallen,
Fallen from his high estate,
And weltering in his blood;
Deserted, at his utmost need,
By those his former bounty fed;
On the bare earth exposed he lies
With not a friend to close his eyes.
—With downcast looks the joyless victor sate,
Revolving in his alter'd soul !
The various turns of Chance below;
And now and then a sigh he stole,
And tears began to flow.

The mighty master smiled to see
That love was in the next degree;
'Twas but a kindered sound th move,
For pity melts the mind to love.
Softly sweet, in Lydian measures
Soon he soothed his soul to pleesures,
War, he sung, is toil and troble,
Honour but an empty bubble;
Never ending, still, beginning,
Fighting still, and still destroying;
If the world be woith thy winning,
Think. O think, it worth enfoying;

Lovely Thais sits beside thee,
Take the good the gods provide thee!
—The many rend the skies with loud applause;
So love was crown'd, but Music won the cause.
The prince, unable to conceal his pain,
Gazed on the fair
Who caused his care,
And sigh'd and look'd, sigh'd and look'd
Sigh'd and look'd, and sigh'd again ;
At length with love and wine at once opprest
The vanquish'd victor sunk upon her breast.

Now strike the golden lyre again :
A louder yet, and yet u louder strain!
Break his bands of sleep asunder
And rouse him like a rattling peal of thunder.
Hark, hark ! the horrid sound
Has raised up his head :
As awaked from the dead

And amazed he stares around.
Reveuge, revenge, Timotheus cries,
See the Furies arise!

See the snakes that they rear
How they hiss in their hair,
And the sparkles that flash from their eyes;
Behold a ghastly band,
Each a torch in his hand!
Those are Grecian ghosts, that in battle were slain
And unburied remain
Ingiorious on the plain:
Give the vengeance due
To the valiant crew!
Behold how they toss their torches on high,
How they point to the Persian abodes
And glittering temples of their hostile gods.
—The princes applaud with a furious joy:
And the King seized a flambeau with zeal to destroy
Thais led the way
To light him to his prey,
And like another Helen, fired another Troy!

J. DRYDEN.

Ode on the Poets

Bards of Passion and of Mirth
You have left your souls on earth i
Have ye souls in heaven too,
Double-Live in regions new?

Yes, and those of heaven commune
With the spheres of sun and moon;
With the noise of fountains wond'rous
And the parle of voices thund'rouse;

With the whisper of heaven's trees
And one another, in soft ease
Seated on Elysian Lawns
Brows'd by none but Dian's fawns;
Underneath large blue-bells tented,
Where the daisies are rose-scented,
And the rose herself has got
Perfume which on earth is not;
Where the nightingale doth sing
Not a senseless, tranced thing,
But divine melodious truth;
Philosophic numbers smooth;
Tales and golden histories
Of heaven and its mysteries.

Thus ye live on high, and then
On the earth ye live again;
And the souls ye left behind you,
Teach us, here, the way to find you,
where your other souls are joying,
Never slumber'd, never cloying.
Here, your earth-born souls still speak
To mortals, of their little weak;
Of their sorrows and delights;
Of their passions and their spites;
Of their glory and their shame;
What doth strengthen and what maim :-

Thus ye teach us, every day,
Wisdom, though fled far away.

Bards of passion and of Mirth
Ye have left your souls on earth!
Ye have souls in heaven too,
Double-Lived in regions new!

J. KEATS

Shakespeare

Others abide our question-Thou art free ;
We ask and ask–Thou smilest and art still,
Out-topping knowledge! So some sovran hill
Who to the stars uncrowns his majesty.
Planting his steadfast footsteps in the sea,
Making the heaven of heavens his dwelling-place
Spares but the border, often, of his base
To the foil'd searching of mortality;
And thou, whose head did stars and sunbeams know,
Self-school'd, self-scann'd, self-honour'd, self-secure,
Didst walk on earth unguess'd at–Better so!
All pains the immortal spirit must endure,
All weakness which impairs, all griefs which bow,
Find their sole voice in that victorious brow.

M. ARNOLD

The Festival of Serpents

Shining ones awake, we seek your chosen temples
In caves and sheltering sandhills and sacred banyan roots;
O lift your dreaming heads from their trance of ageless wisdom,
And weave your mystic measures to the melody of flutes.
We bring you milk and maize, wild figs and golden honey,
And kindle fragrant incense to hallow all the air,
With fasting lips we pray, with fervent heart we praise you,
O bless our lowly offerings and hearken to our prayer,
Guard our helpless lives and guide our patient labours,
And cherish our dear vision like the jewels in your crests;
O spread your hooded watch for the safety of our slumbers,
And soothe the troubled longings that clamour in our breasts.
Swift are ye as streams and soudless as the dewfall,
Subtle as rhe lightning and splendid as the sun;
Seers are ye and symbols of the ancient silence,
Where life and death and sorrow and ecstasy are one

SAROJINI NAIDU

Ode on the Pleasure Arising from Vicissitude

NOW the golden Morn aloft
  Waves her dew-bespangled wing,
With vermeil cheek and whisper soft
  She woos the tardy Spring:
Till April starts, and calls around
The sleeping fragrance from the ground,
And lightly O'er the living scene
Scatters his freshest, tenderest green.

New-born flocks, in rustic dance,
  Frisking ply their feeble feet;
Forgetful of their wintry trance
  The birds his presence greet:
But chief, the sky-lark warbles high
His trembling thrilling ecstasy;
And lessening from the dazzled sight,
Melts into air and liquid light.

Yesterday the sullen year
  Saw the snowy whirlwind fly;
Mute was the music of the air,
  The herd stood drooping by;
Their raptures now that wildly flow
No yesterday nor morrow know;
'Tis Man alone that joy descries
With forward and reverted eyes.

Smiles on past Misfortune's brow
  Soft Reflection's hand can trace,
And o'er the cheek of Sorrow throw
  A melancholy grace;
While Hope prolongs our happier hour,
Or deepest shades, that dimly lour
And blacken round our weary way,
Gilds with a gleam of distant day.

Still, where rosy Pleasure leads,
  See a kindred Grief pursue;
Behind the steps that Misery treads
  Approaching Comfort view:
The hues of bliss more brightly glow
Chastised by sabler tints of woe,
And blended form, with artful strife,
The strength and harmony of life.

See the wretch that long has tost
  On the thorny bed of pain,
At length repair his vigour lost
  And breathe and walk again:
The meanest flowerest of the vale,
The simplest note that swells the gale,
The common sun, the air, the skies,
To him are opening Paradise.

T. GRAY

Remembrance

WHEN to the sessions of sweet silent thought
  I summon up remembrance of things past,
I sigh the lack of many a thing I sought,
  And with old woes new wail my dear time's waste;

Then can I drown an eye, unused to flow,
  For precious friends hid in death's dateless night,
And weep afresh love's long-since-cancell'd woe,
  And moan the expense of many a vanish'd sight.

Then can I grieve at grievances foregone,
  And heavily from woe to woe tell o'er
The sad account of fore-bemoaned moan,
  Which I now pay as if not paid before:

—But if the while I think on thee, dear friend,
All losses are restored, and sorrows end.

W. SHAKESPEARE

The Sins of Love

Forgive me the sins of mine eyes,
O Love, if they dared for a space
Invade the dear shrine of your face
With eager, insistent delight,
Like wild birds interpid of flight
That raid the high sanctuaried skies
O pardon the sin of mine eyes !

Forgive me the sin of my hands
Perchance they were bold overmuch
In their tremulous longing to touch
Your beautiful flesh, to caress,
To clasp you, O Love, and to bless
With gifts as uncounted as sands
O pardon the sin of my hands !

SAROJINI NAIDU

True Love

LET me not to the marriage of true minds
Admit impediments. Love is not love
Which alters when it alteration finds,
Or bends with the remover to remove :—

O no ! it is an ever-fixed mark
That looks on tempests, and is never shaken ;

It is the star to every wandering bark,
Whose worth's unknown, although his height be taken.

Love's not Time's fool, though rosy lips and cheeks
Within his bending sickle's compass come ;
Love alters not with his brief hours and weeks,
But bears it out ev'n to the edge of doom :—

If this be error, and upon me proved,
I never writ, nor no man ever loved.

W. SHAKESPEARE

Song

Sweet are ye, O ye blossom with months of
dripping honey,
But I have known a breath that filled my hours
with richer balm,
And I have known a bolder grace than yours,
O slim lianas,
A statelier grace than yours, O Sun lit cypress
and O palm!
Soft are your caresses, O winds from blowing
valley,
But I have known a touch that stirred my blood
to subtler pains,
And I have known a voice that called with
diviner cadence
Than lit of vernal rivers and the song of
autumn rain,
Swift art thoui O lightning, to seer the purple
midnight,
But I have known a glance that burned with
more intrepid flame,
And I have known a prouder heart than yours,
O dauntless eagle,
A wilder heart no love could teach, no destiny
could tame.

SAROJINI NAIDU

The Comming of Spring

O spring! I cannot run to greet
Your coming as I did of old,
Clad in a shining reil of gold,
With champa-buds and blowing wheat
And silver anklets on my feet.

Let others tread the flowering ways
And pluck new leaves to find their braws,
And swing beneath the quickening boughs
A bloom with scented spikes and sprays
Of coral and of chrys oprase.

But if against this sheltering wall
I lean to rest and lag behind,
Think not my love untrue, unkind,
Or heedless of the luring call
To your enchanting festival.

SAROJINI NAIDU

Transience

Nay, do not grieve tho' life be full of sadness,
Dawn will not veil her splendour for your grief,
Nor spring deny thier bright, appointed beauty
To lotus blossom and ashoka leaf.

Nay, do not pine, tho' life be dark with trouble,
Time will not pause or tarry on his way;
To-day that seems so long, so strange, so bitter,
Will soon be some forgotten yesterdasy.

Nay, do not weep, new hopes, new dreams,
new faces,
The unspent joy of all the unborn years,
Will prove your heart a traitor to its sorrow,
And make your eyes unfaithful to thier tears.

SAROJINI NAIDU

A Challenge to Fate

Why will you vex me with your futile conflict,
Wy will you strive with me, O Foolish Fate ?
you cannot break me with your poignant envy,
You cannot slay me with your subtle hate ;
For all the cruel folly you pursue
I will not cry with suppliant hands to you.

You may perchance wreck in your bitter malice
The radiant empire of mine eager eyes
Say, can you rob my memory's dear dominion
O'er sunlit mountains and sidereal skies ?
In my enduring treasuries I hold
Their ageless splendour of unravished gold.

You may usurp the kingdoms of my hearing
Say, shall my seatheless spirit cease to hear
The bridle rapture of the blowing valleys,
The lyric pageant of the passing year,
The sounding odes and surging harmonies
Of battling tempests and unconquered seas ?

SAROJINI NAIDU

To Althea from Prison

WHEN Love with unconfined wings
  Hovers wifhin my gates,
And my divine Althea brings
  To whisper at the grates;
When I lie tangled in her hair
  And fetter'd to her eye,
The Gods that wanton in the air
  Know no such liberty.

When flowing cups run swiftly round
  With no allaying Thames,
Our careless heads with roses crown'd,
  Our hearts with loyal flames;
When thirsty grief in wine we steep.
  When healths and draughts go free—
Fishes that tipple in the deep
  Know no such liberty.

Stone walls do not a prison make,
  Nor Iron bars cage;
Minds innocent and quiet take
  That for an hermitage:
If I have freedom in my love
  And in my soul am free,
Angels alone, that soar above,
  Enjoy such liberty.

COLONEL LOVELACE

Suttee

Lamp of my life, the lips of Death
Hath blown thee out with their sudden breath;
Naught shall revive thy vanished spark
Love, must I dwell in the living dark?

Tree of my life, Death's cruel foot
Hath crushed these down to the hidden root;
Nought shall restore thy glory fled
Shall the blossom live when the tree is dead?

Life of my life, Death's bitter sword
Hath severed us like a broken word,
Rent us in twain who are but one
Shall the flessh survive when the soul is gone?

SAROJINI NAIDU

A Prayer of Islam

We priase Thee, O Compassionate!
Master of Life and Time and Fate,
Lord of labouring winds and seas,
YA HAMEED! YA HAFEEZ'!

Thou art the Radiance of our ways,
Thou art the Pardon of our days,
Whose home is known from star to star,
YA GHANI! YA GHAFFAAR!

Thou art the Goal for which we long,
Thou art our Silence and our Song,
Life of the sunbeam and the seed,
YA WAHHAAB! YA WAHEED!

Thou dost transmute from hour to hour
Our mortal weakness into power,
Our bondage into liberty.
YA QUADEER! YA QUAVII!

We are the shadows of Thy Light,
We are the secrets of Thy Might,
The visions of Thy primal Dream.
YA RAHMAAN! YA RAHEEM!

SAROJINI NAIDU

The Motherland

How can I serve thee, I who am so week?
Beloved land !
Make thou my loving heart a deathless lute
within the hand.

What can I give thee, I who am so poor?
O thou most sweet !
Let my life blossom like a lotus-flower
Under thy feet.

SAROJINI NAIDU

Lily

The serpent are asleep among the poppies,
The fireflies light the soundless panther's way
To tangled paths where shy gazelles are straying,
And parrot-plumes outshine the dying day.
O soft ! lotus-buds upon the stream
Are stirring like sweet maidens when they dream.

A caste-mark on the azure brows of Heaven,
The golden moon burns sacred, solemn, bright
The winds are dancing in the forest-temple,
And sweening at the holy feet of Night.
Hush ! in the silence mystic voices sing
And make the gods their incense-offering.

SAROJINI NAIDU

Death and Life

Death stroked my hair and whispered tenderly :
"Poor child, shall I redeem thee from thy pain,
Renew thy joy and issue thee again
Inclose in some renascent ecstasy
Some lilting bird or lotus-loving bee,
Or the diaphanous silver af the rain,
Th' allurrng scent the sirisha-plain,
The wild wind's voice, the white wave's melody?"

I said "Thy gentle pity shames mine ear,
O Death, am I so purposeless a thing,
Shall my soul falter or my body fear
Its poignant hour of bitter suffering,
Or failure I achieve my destined deed
Of song or service for my country's need?"

SAROJINI NAIDU

Hymn to Diana

QUEEN and Huntress, chaste and fair,
Now the sun is laid to sleep,
Seated in thy silver chair,
State in wonted manner keep:
Hesperus entreats thy light,
Goddess excellently bright.

Earth, let not thy envious shade
Dare it self to interpose;
Cynthia's shinning orb was made
Heaven to clear when day did close:
Bless us then with wished sight,
Goddes excellently bright.

Lay thy bow of pearl apart
And thy crystal-shining quiver;
Give unto the flying hart
Space to breathe, how short soever:
Thou that mak'st a day of night,
Goddess excellently bright!

B. JONSON.

Village Song

Full are my pitchers and far to carry,
Lone is the way and long,
Why, O why was I tempted to tarry
Lured by the boatmen's song?
Swiftly the shadows of night are falling,
Hear, O hear is the white crane calling,
Is it the wild Owl's Cry?
There are no tender moon breams to light me,
If in the daıkness a serpent should bite me,
Or if an evil spirit should smite me,
Ram re Ram! I shall die.
My brother's murmur "Why doth she linger?"

My mother will wait and weep,
Saying "O safe may the great gods bring her,
The Jamuna's water are deep."
The Jamuna's water rush by so quickly,
The shadows of evening gather so thickly,
Like black birds in the sky
O! if the storm bıeaks, what will betide me?
Safe from the lightning where shall I hide me?
Unless Thou succour my foot steps and guide me,
Ram re Ram! I shall die.

SAROJINI NAIDU

DIRGE
In Sorrow of her Bereavement

What longer need hath she of loveliness
Whom Death has parted from her lord's caress ?
Of glimmering robes like rainbow-tangled mist,
Of gleaming glass or jewels on her wrist,
Blossoms or fillet-pearls to deck her head,
Or jasmine garlands to adorn her bed. ?

Put by the mirrow of her bridal days
Why needs she now its counsel or its praise,
Or happy symbol of the henna leaf
For hands that know the comradeship of grief,
Red spieces for her lids that drink of sighs,
Or black collyrium for her weeping eyes ?

SAROJINI NAIDU

Golden Cassia

O brilliant blossoms that strew my way,
You are only woodland flowers they say.

But, I sometimes think that perchance you are
Fragrants of some new-fallen star;

Or golden lamps for a fairy shrine,
Or golden pitchers for fairy wine.

Perchance you are, O frail and sweet!
Bright anklet-bells from the wild spring's feet,

Or the gleaming tears some fair bride shed
Remembering her lost maidenhead.

But now, in the memoried dusk you seem
The glimmering ghosts of a by gone dream.

SAROJINI NAIDU

A Consolation

WHEN in disgrace with fortune and men's eyes
I all alone beweep my outcast state,
And trouble deaf heaven with my bootless cries,
And look upon myself, and curse my fate;

Wishing me like to one more rich in hope,
Featured like him, like him with friends possest,
Desiring this man's art, and that man's scope,
With what I most enjoy contented least;

Yet in these thoughts myself almost despising,
Haply I think on Thee–and then my state,
Like to the lark at break of day arising
From sullan earth, sings hymns at heaven's gate;

For thy sweet love remember'd such wealth brings,
That then I scorn to change my state with kings.

W. SHAKESPEARE

The Triumph of Death

No longer mourn for me when I am dead
Then you shall hear the surly sullen bell
Give warning to the world, that I am fled
From this vile world, with vilest worms to dwell;

Nay, if you read this line, remember not
The hand that writ it; for I love you so,
That I in your sweet thoughts would be forgot
If thinking on me then should make you woe.

O if, I say, you look upon this verse
When I perhaps compounded am with clay,
Do not so much as my poor name rehearse,
But let your love even with my life decay;

Lest the wise world should look into your moan,
And mock you with me after I am gone.

W. SHAKESPEARE

Jean

OF a' the airts the wind can blow
I dearly like the West,
For there the bonnie lassie lives,
The lassie I lo'e best:
There's wild woods grow, and rivers row,
And many a hill between;
But day and night my fancy's flight
Is ever wi' my Jean.

I see her in the dewy flowers,
I see sweet and fair:
I hear her in the tunefu' birds,
I hear her charm the air:
There's not a bonnie flower that springs
By fountain, shaw, or green,
There's not a bonnie bird that sings
But minds me o' my Jean.

R. BURNS

The Nightingale

As it fell upon a day
In the merry month of May,
Sitting in a pleasant shade
Which a grove of myrtles made,
Beasts did leap and birds did sing,
Trees did grow and plants did spring,
Every thing did banish moan
Save the Nightingale alone.

She, poor bird, as all forlon,
Lean'd her breast up-till a thorn,
And there sung the dolefull'st ditty
That to hear it was great pity.
Fie, fie, fie, now would she cry;
Tereu, tereu, by and by:
That to hear her so complain
Scarce I could from tears refrain;
For her griefs so lively shown
Made me think upon mine own.

—Ah, thought I, thou mourn'st in vain;
None takes pity on thy pain:
Senseless trees, they cannot hear thee,
Ruthless beasts, they will not cheer thee,
King Pandion, he is dead,
All thy friends are lapp'd in lead:
All thy fellow birds do sing
Careless of thy sorrowing:
Even sok poor bird, like thee
None alive will pity me.

R. BARNFIELD.

Summons to Love

PHOEBUS, arise!
And paint the sable skies
With azure, white, and red:
Rouse Memnon's mother from her Tithon's bed
That she thy career may with roses spread:
The nighthtingales thy coming each-where sing;
Make an eternal spring,
Give life to this dark world which lieth dead;
Spread forth thy golden hair
In larger locks than thou wast wont before,
And emperor-like decore
With diadem of pearl thy temples fair:
Chase hence the ugly night
Which serves but to make dear thy glorious light.

—This is that happy morn,
That day, long-wished day
Of all my like so dark,
(If cruel stars have not my ruin sworn
And fates my hopes betray),
Which purely white, deserves
An everlasting diamond should it mark.

This is the morn should bring unto this grove
My Love, to hear and recompense my love.
Fair King, who all preserves,
But show thy blushing beams,
And thou two sweeter eyes
Shalt see than those which by Peneus' streams
Did once thy heart surprise.

Now, Flora, deck thyself in fairest guise :
  If that ye, winds, would hear
A voice surpassing far Amphion's lyre,
  Your furious chiding stay ;
  Let Zephyr only breathe,
  And with her tresses play.
  —The winds all silent are,
  And Phoebus in his chair
  Ensaffroning sea and air
  Makes vanish every star ;
  Night like a drunkard reels
Beyond the hills, to shun his flaming wheels ;
The fields with flowers are deck'd in very hue,
The clouds with orient gold spangle their blue ;
  Hear is the pleasant place—
And nothing wanting is, save She, alas !

W. DRUMMOND

مطبوعات ولا اکیڈمی

دین یار جنگ زندگی اور کام	برق موسوی	۴-۰۰
سخن در سخن (مجموعۂ رباعیات)	نواب مظفر الدین خاں صاحب	۴-۰۰
افق در افق 〃	〃 〃	۸-۵۰
ادراک معنی	طیّب انصاری	۶-۰۰
میرا شہر میرے لوگ	〃	۵-۰۰
مفہوم القرآن (پارہ ۱ تا ۹)	کیف بھوپالی (فی پارہ)	۲-۰۰
نگارشات حمایت	کرنل حمایت بیگ	۳-۰۰
وجود و شہود	عطا کلیانوی	۴-۰۰
صحرا کا سفر	راہی قریشی	۳-۵۰
نذرِ خسرو	ایس۔ ایس لانبہ	۷-۰۰
میخانہ (مجموعۂ کلام)	میکش حیدرآبادی	۱۰-۰۰
محمّد بن عبدالوہاب	محی الدین احمد	۵-۰۰
اردو الفاظ شماری	حسن الدین احمد	۸۵-۰۰
مقدمہ اردو الفاظ شماری	〃 〃	۳-۰۰
انجمن (سوانحی مضامین کا مجموعہ)	〃 〃	۱۵-۰۰
جامع العطیات	ضیاء الدین احمد شکیب و حسن الدین احمد	[illegible]۵-۰۰
داستانِ عجم (فارسی) طبع دوم	شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولاؔ	[illegible]۰-۰۰
تاریخ النوائط حصّہ اوّل 〃	〃 〃	[illegible]۰-۰۰

ولا اکیڈمی۔ عزیز باغ سلطان پورہ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۴